پردہ اُٹھتا ہے

شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

پردہ اُٹھتا ہے

شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب	:	پردہ اٹھتا ہے
مؤلف	:	شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ
ایڈیٹر	:	سید علی مہدی باقری
ناشر	:	شیعہ ورلڈ فیڈریشن لندن
سال اشاعت	:	۱۹۹۱ء
کاتب	:	عارف سہسوانی
طابع	:	ایرانین آرٹ پریس دہلی

اِس کتاب کی اِشاعت کے مصارف شیعہ ورلڈ فیڈریشن لندن نے تامین کئے ہیں۔

باہتمام ایشین پبلیشرز
اے۔سی۔۴/۵۶ سی
شالیمار باغ ۔ نئی دہلی ۔ ۵۲

ASIAN PUBLISHERS
AC IV / 56C, SHALIMAR BAGH
NEW DELHI - 52

قیمت : ۸۰/روپیہ ، ۵/پاونڈز ، ۱۰/ڈالرز

مومنین سے درخواست ہے کہ شیعہ ورلڈ فیڈریشن کے حصول ومقاصد اور توفیق کے واسطہ دعاء فرمائیں

پردہ اٹھتا ہے

حضرت شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

کی پیش کش

زیر سرپرستی جناب حجۃ الاسلام والمسلمین

الحاج اصغر علی محمد جعفر المعروف ملا اصغر مدظلہ

بانی وصدر شیعہ ورلڈ فیڈریشن ۔ لندن

زیر سرپرستی جناب حجۃ الاسلام والمسلمین

ایڈیٹر سید علی مہدی باقری

باہتمام ایشین پبلیشرز : اے سی ۴/۵۶-سی

شالیمار باغ ۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۵۲

فون : 7233629

فہرست مطالب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝٦١

(آل عمران پارہ ۳)

... آؤ رو در رو ہو کر بات طے کر لیں تم اپنے خاندان کے افراد کو لے آؤ ہم اپنے خاندان کے افراد کو لے آتے ہیں۔ پھر خدا کے حضور سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کی درخواست پیش کرتے ہیں تاکہ جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار ڈالیں۔

(آل عمران پارہ ۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب شریف "پردہ اٹھتا ہے"، حضرت شہید سید زعمیر فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی تحقیق اور استبصار کی روشنی ہے۔ حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ الحاج آقای اصغر علی محمد جعفر المعروف ملا اصغر صاحب قبلہ حفظ اللہ تعالیٰ بانی وموسس اور صدر شیعہ ورلڈ فیڈریشن کی حسب فرمائش۔ جہت احقاق الحق ہندوستان میں شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے مصارف شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن نے فراہم کئے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شیعہ ورلڈ فیڈریشن اور اس کے بانی اور جمیع اولیاء کو زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

شیعہ ورلڈ فیڈریشن کی طرف سے ایشین پبلیشرز کے اہتمام سے حسب ذیل کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۔ مکتب تشیع	قیمت ۶۰ روپیہ
۲۔ انقلاب اسلامی حضرت امیر مختار علیہ السلام	″ ۵۰ ″
۳۔ ہدایت الحق	″ ۷۵ ″
TO WARDS KARBALA ۔۴	″ ۷۰ ″
۵۔ مع الصادقین۔ سچوں کے ساتھ	″ ۷۵ ″
۶۔ حضرت مولائے کائنات اور ان کے سیاسی حریف	″ ۵۰ ″
۷۔ پردہ اٹھتا ہے	″ ۷۵ ″

خواہش مند حضرات مذکورہ کتابوں کو ایشین پبلیشرز سے طلب فرمائیں شیعہ ورلڈ فیڈریشن دنیا بھر میں اسی طرح ہر زبان میں شیعہ مکتب فکر کی کتابوں کو شائع ونشر کرتی ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرات اہل بیت طاہرین (ع) کے وسیلہ سے درخواست کرتا ہوں کہ شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن اور اس کے بانی وصدر محترم جناب ملا اصغر صاحب قبلہ مدظلہ کو طول عمر عطا فرمائے اور ان کے فیض کو عام کرے۔ آمین۔

سید علی مہدی باقری

۶ دسمبر ۱۹۹۱ء

ان کے بڑے گہرے روابط برقرار تھے۔

جناب مُلّا اصغر صاحب نے مومباسا میں اپنی تعلیم حاصل کی اور انگریزی، گجراتی، اُردو، عربی، فارسی اور سہیلی زبانوں پر کامل تسلّط حاصل کیا۔ جناب مُلّا صاحب ان زبانوں میں بہترین تقریر کرتے اور مجلس پڑھا کرتے ہیں۔ ملّا صاحب نے اپنی دینی اور سماجی خدمات کو ۱۹۵۱ء میں مومباسا سے شروع کیا یعنی عنفوانِ جوانی میں وہ بزرگانِ قوم سے دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں وہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک خوجہ شیعہ اثنی عشری جماعت افریقہ کے آنریری سکریٹری رہے ہیں۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۳ء تک جماعت کے نائب صدر رہے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک وہ مومباسا سے نیروبی سکونت کے لئے چلے گئے اور وہاں انھوں نے مختلف میدانوں میں جماعت کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔

۱۹۸۲ء میں وہ عتباتِ عالیہ کی زیارات کے لئے ایران اور عراق تشریف لے گئے اور عراق میں چار ماہ تک ملّا صاحب ظالم و جابر طاغوت کی سخت قید و بند میں گرفتار رہے اور اس عرصہ میں آنجناب نے شیاطین دژخیمان کے ہر قسم کے آزار ستم اور مظالم سہے۔ قیدِ ظلم سے رہائی کے بعد لندن تشریف لائے اور ۱۹۸۲ء میں لندن ہی میں مقیم ہو گئے۔ وہ ابھی نیروبی ہی میں تھے کہ شیعہ ورلڈ فیڈریشن کی ۱۹۷۶ء میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۷۹ء تک صدر رہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں لندن میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی، اور فیڈریشن کا آفس نیروبی سے لندن منتقل ہو گیا۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک فیڈریشن کے مدیر رہے۔ پھر ۱۹۸۸ء میں انھیں دوسری مرتبہ فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا اور اب ۱۹۹۱ء میں پھر صدارت کے عہدہ کے لئے ان کا انتخاب کیا گیا۔

جناب ملّا اصغر صاحب قبلہ ہمیشہ تبلیغِ دین اور خدماتِ عامہ کے عنوان سے دوسرے ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مرتبہ ہند، پاکستان، کناڈا

ذکرِ جمیل

اپنے محترم قارئین کے شدید اصرار کے سامنے جز تسلیم ہونے کے راہِ چارہ نہیں تھی۔ ہمارے دوست و احباب بار بار یہ فرمائش کرتے تھے کہ حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین الحاج علامہ آقائے اصغر علی المعروف بملا اصغر حفظہ اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر و ہر دلعزیز شخصیت کے اطراف و جوانب کو خامۂ تحریر سے مرتسم کر دیں۔ لیکن یہ کام ہمارے واسطے بیحد دشوار اور مشکل ہے۔ کیونکہ ہمہ آتشہ اور متعدد ابعاد والی ہستی کی صحیح تعریف بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔ یہاں منطقی ناطقہ بھی دم توڑ دیتا ہے۔ لیکن دوستوں کے حکم سے سرپیچی بھی کوئی لائق تحسین کام نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے سیکڑوں کی تعداد میں مومنین نے فرمائش کی ہے کہ ایشین پبلشرز کی طرف سے شائع ہونے والی کسی کتاب میں حضرت علامہ اصغر علی ملا اصغر مدظلہ کی سوانح حیات پیش کر دیں تاکہ راہِ خدا میں قدم رکھنے والوں کو حوصلہ ملے اور سنگِ میل کے عنوان سے نقشِ قدم کا سہارا مل جائے۔ یہاں محسوس ہو رہا ہے کہ ایسی عظیم الشان اور ہمہ آتشہ ہستی کے بارے میں قلم اٹھانا بیشک ایک مشکل امر ہے۔

جناب ملا اصغر مدظلہ مرجعِ تقلید نہیں ہیں۔ ہاں بیشک مرجعیت کی تشخیص میں وہ یقیناً ایک خدا شناس اہلِ خبرہ ہیں۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ جب نجفِ اشرف

اور امور میں غور و فکر کرنے کی مجال کب پاتے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ وہ ہیں کیا اور کیوں آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ وہ صرف کھانے پینے والے انسان ہیں اور دُنیا والوں نے کبھی اس کو حیوانِ ناطق کہا اور کبھی سماجی حیوان۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اگر اندیشہ سے بھی آراستہ ہو تب بھی حیوان ہی ہے۔ اور اگر وہ اپنے سماج کا سچّا خدمت گذار ہو تب بھی حیوان ہی ہے۔

اسلام آیا اور اُس نے معیارِ فضیلت ہی بدل دیا۔ اسلام نے کہا کہ انسان ایک خدا ئی مخلوق ہے۔ انسان کے اس خطاب میں اس کی اصلی عزّت و افتخار ہے۔ انسانِ خدائی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو صرف خدا کا ہو کر رہنا ہے یعنی اُس کا ہر کام خُدا کے لئے ہو۔ اُس کی موت خدا کے لئے ہو، اس کا حشر خدا کے لئے ہو اور نشر بھی خدا کے لئے ہو۔

ہمارا رہبر قائد، لیڈر حضرت علّامہ الحاج اصغر علی مُلّا اصغر مدظلہٗ لاریب خدا کے لئے ہے۔ ان کی ہستی، وجود، اعضاء و جوارح ہمگی للہ رب العالمین ان کا سب کچھ خدا کے لئے ہے۔

جناب اصغر علی مُلّا اصغر صاحب مدظلہٗ نے مشرقی افریقہ کے مومباسا شہر میں ۱۹۳۶ء میں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد صاحب جناب ملّا محمد جعفر (ر) مشہور و معروف ذاکر حسین (ع)، اور خطیب آلِ محمدؐ تھے۔ وہ مدّتوں مومباسا میں حسینی نائٹ اسکول کے پرنسپل رہے ہیں۔ ان کے جدِّ امجد حاجی محمد جعفر شریف دیو جی بھی مشہور ذاکر حسینؑ اور بڑے پایہ کے تاجر تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم میں بیس سے زیادہ کتابیں گجراتی زبان میں لکھی ہیں۔ ان کی دو کتابیں "امامِ زمانہ" اور "رویتِ ہلال" کا اُردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ انھیں کے مُبارک ہاتھوں سے مومباسا میں حسینی نائٹ اسکول کی بنیاد پڑی اور آنمرحوم سالہا سال اس اسکول کے پرنسپل رہے ہیں۔ انھوں نے افریقہ کے کونے کونے میں صدائے توحید کا پرچار کیا ہے۔ ہندوستان بھر کے علماء اور مدارس سے

یوروپ، امریکہ کے فیڈریشن کی طرف سے دورے کئے اور کرتے رہتے ہیں۔ آنجناب نے ۱۹۸۶ء میں مدرسہ سید الخوئی کی بنیاد ڈالی۔ اس مدرسہ میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ملّا صاحب بہ نفسِ نفیس اس مدرسہ کے مُدیرِ اعلیٰ ہیں۔

۱۹۸۶ء سے آج تک شبِ شنبہ کو مرکزِ اسلامی اسٹینمور میں انگریزی میں ملّا صاحب کا لیکچر ہوا کرتا ہے! اس لیکچر کا آفاق میں شہرہ ہے۔ موسمِ سرما میں شنبہ اور یکشنبہ کے روز صبح کی نماز کی امامت اور بعد نماز علومِ اسلامی کے موضوعات پر تقریر فرماتے ہیں ملّا صاحب کی تقاریر اور مجالس ویڈیو اور آڈیو کیسٹ پر دُنیا بھر میں سُنی جاتی ہیں! اسلامی مرکز اسٹینمور میں نمازِ جماعت کی امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

مُلّا صاحب کی ہمہ جانبہ جذاب شخصیت نے انھیں قوم میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ ان کی محبوب ہستی کے بارے میں کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں اختصار سے کام لیتے ہوئے بس اُن کے حق میں دُعائے خیر کے کلمات پر اکتفا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت محمدؐ و آلِ محمدؐ کے واسطہ سے دُعا کرتا ہوں کہ ہمارے اس سچے، اچھے، مہربان رہبر اور قائد کو صحت و عافیت کے ساتھ طولِ عمر اور توفیق عطا فرمائے۔ اور شیطانی فطرت والے حاسدین اور دُشمنوں کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے اُن کے دشمنوں کی آنکھوں میں خاک اور دوستوں کے دل شاد۔ آمین یا الٰہی آمین۔

سیّد علی مہدی باقری

۲۰ نومبر ۱۹۹۱ء۔ دہلی۔

علماء ومجتہدین اور علوم آلِ محمدؑ کا مرکز تھا۔ اس وقت وہاں کے مجتہدین اور بڑے پایہ کے علماء کی نظر میں جناب مُلّا اصغر مدظلہٗ کا ایک مقام و مرتبہ اور احترام تھا حضرت آیات عظام آقائے محسن الحکیم رضوان اللہ تعالیٰ علیہ و آقائے سید ابوالقاسم الخوئی۔ آقائے سید عبدالاعلیٰ سبزواری۔ آقائے سید رضا صدر۔ آقائے سید محمد رضا گلپایگانی آقائے سید علی خامنہ ای مدظلہم نے انھیں اپنا اپنا وکیلِ مطلق نامزد کیا ہے۔ اور ہر مرجع تقلید نے ملّا صاحب کو اپنا خاص نمائندہ مقرر کرتے ہوئے فخر و افتخار محسوس کیا ہے۔

جناب ملّا اصغر مدظلہٗ کی شخصیت کے بارے میں دوسرا پہلو ان کے مبلغ علم کا ہے یہاں بھی اختصار گوئی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ عرض کر دینا کافی ہوگا کہ لندن میں مشہور و معروف مدرسہ خوئی میں دنیا بھر سے آئے ہوئے علم و دانش کے پیاسوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اور فقہ و اُصول، فلسفہ و منطق، تفسیر و حدیث اور علمِ کلام میں محققین کی رہنمائی کرتے ہیں۔

خطابت کے میدان میں ملّا اصغر صاحب اُردو، انگریزی، سہیلی، فارسی اور عربی، زبان میں قدرتمند فصیح و بلیغ سخنور اور خطیب ہیں۔ اور دنیا بھر میں ان کی تقریروں کی ویڈیو اور آڈیو کیسٹنز بڑے شوق سے سُنی جاتی ہیں اور اہلِ حق اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

آستانۂ اہلِ بیت اطہار (ع) سے ملّا صاحب کی وابستگی محکم و استوار ہے اور مذہب اہلِ حق کے پیروکار انھیں اپنا رہبر مانتے ہیں۔

جناب مُلّا اصغر صاحب مدظلہٗ کی خواہش ہے کہ افراد بشر علوم آلِ محمدؐ سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں اس لئے ان کا حکم ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں ایسی کتابیں شائع ہوتی رہیں کہ جن کے مطالعہ سے لوگ آلِ محمدؐ کی معرفت حاصل کریں اور اُن کی

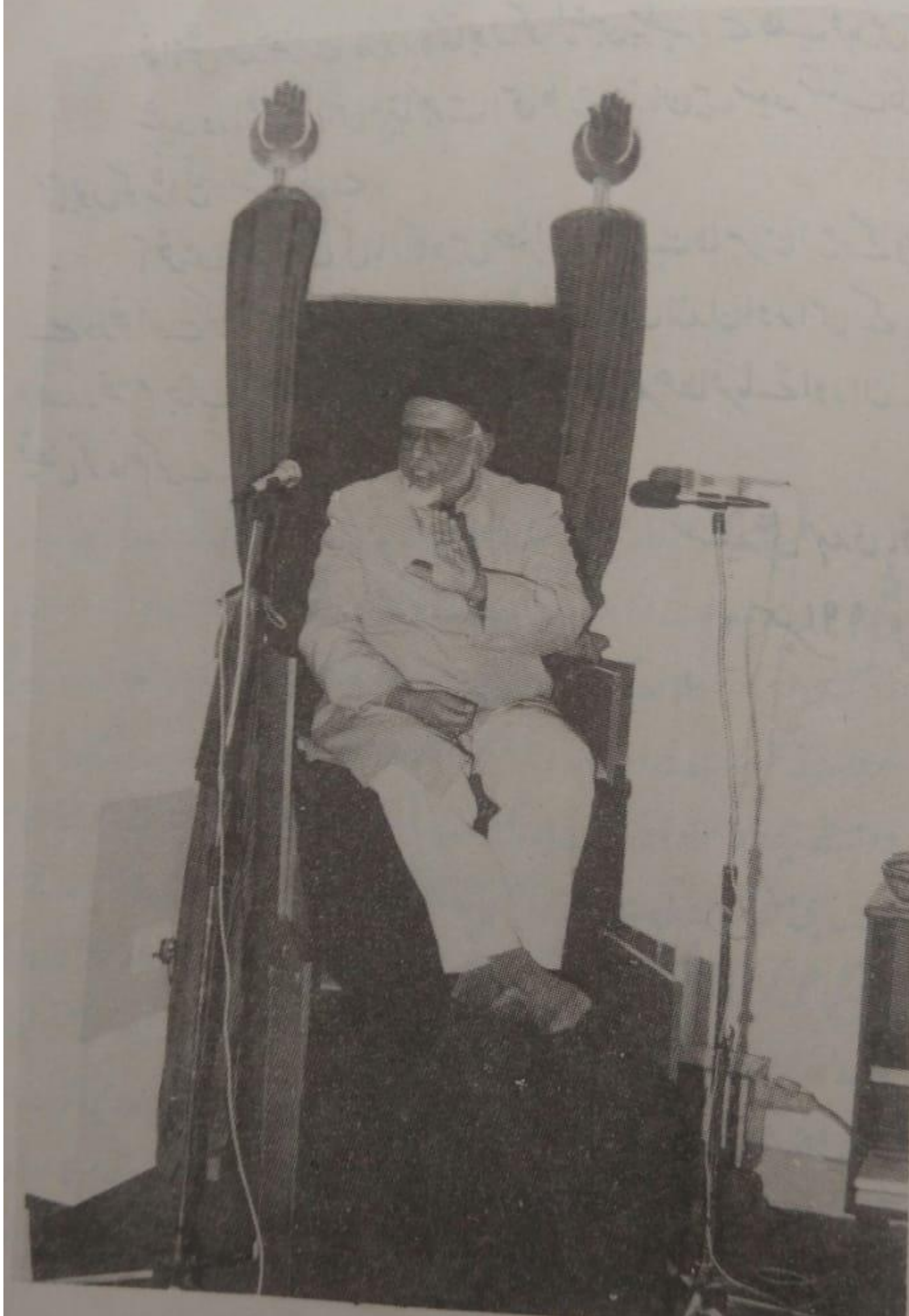
ذات میں حق کی حمایت کا جذبہ بیدار ہو۔

خدمتِ خلق کی مثال ہیں۔ ملا صاحب کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر بیمار آدمی کو علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم ہوں شیعہ ہوں یا سُنّی۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ یہودی ہو یا عیسائی۔ مگر انسان ہو تو ملاّ صاحب اس کے علاج کی سبیل کرتے ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اسپتال قائم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ خانۂ خدا کے حجّاج کی ناگہانی بیماری سے حفاظت کے لئے ماہر ڈاکٹروں کی برجستہ ٹیم کو موسمِ حج میں مکہ معظّمہ کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ غریب نادار اور مستحق سادات طالب علموں کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ ملاّ صاحب کی ہستی مکارم اخلاق کی ہر صفت اور فضیلت سے آراستہ ہے اور وہ فضیلتِ انسانی کے ہر میدان میں فارس اور شہسوار ہیں۔

وہ ایک سچّے مسلمان۔ دیندار متقی، پرہیزگار صاحب زہد و ورع، تقویٰ اور فضیلت ہیں۔ وہ ایک برجستہ انسان اور نمونۂ اخلاقِ حسنہ ہیں۔ انکسار و تواضع میں وہ بے مثال ہیں۔ وہ ایک ذمہ دار، دل سوز مہربان، مخلص، اندیشمند اور دُور اندیش رہبر ہیں۔ وہ ہمیشہ افرادِ بشر کی نجات اور سعادت کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ دن رات میں ۱۸ گھنٹے خدا کے لئے کام کرتے ہیں۔ وہ ایک باعمل برجستہ عالمِ دین ہیں مرجع نہ سہی مگر مرجعیت کے تعیّن میں ان کا مشورہ اوّلیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ تمام مراجعوں کی طرف سے تنہا نمائندۂ جہانی ہیں۔ جناب مُلّا اصغر صاحب مدظلہٗ نے ایک بین الاقوامی ادارہ "شیعہ ورلڈ فیڈریشن" قائم کیا ہے! اس ادارہ کے مقاصد میں افراد بشر اور مسلمان بالخصوص شیعہ حضرات کی سعادت و خوشحالی کی خوابوں کی تعبیر مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ہمارے رہبر کو طول عمر، صحت و سلامتی اور توفیق عطا فرمائے! در آنجناب کے دینی اور دنیوی مقاصد میں کامیاب قرار دے۔

اِس دُنیا میں لوگ قدم رکھتے ہیں زندہ رہے اور چل بسے۔ وہ یہاں سوچنے سمجھنے

aaaaads



حضرت مستطاب جناب علامہ الحاج آقای آقا اصغر علی ملا اصغر مدظلہ
بانی و موسس اور صدر شیعہ ورلڈ فیڈریشن آف لندن

انتساب

یہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۷ء کی گرم رات تھی۔ میں ممباسہ (کینیا) کے ایک مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں ایک شیعی کتب خانہ سے "شبہائے پشاورؒ" نام کی ایک کتاب میرے ہاتھ لگی۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ دورانِ مطالعہ جب اس مقام پر پہونچا جہاں دشمنانِ خاندان رسالت کی طرف سے سیدہ فاطمہ سلام اللہ کے ساتھ بدسلوکی اور گستاخانہ رویہ کے شرمناک مظاہرے کا تذکرہ کیا گیا تھا تو طبیعت پر غم و اندوہ کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں زار و قطار رونے لگا۔ شدتِ غم والم میں میں نے اس بے مروت ٹولے اور اس کے سرغنہ پر پہلی بار لعن و تبرا بھیجا اسی مبارک و مسعود رات کے آخری حصے میں میں نے خواب دیکھا کہ میں حضرت عباسؑ کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوں اور گریہ و بکا کی ایسی حالت میں ہوں کہ اس سے قبل کبھی اس طرح ٹوٹ کر نہیں رویا تھا۔ اس حسین خواب کو اذانِ صبح گاہی کی آواز نے منقطع کیا اور میں بیداری کے بعد بھی دیر تک حیرت و سرگشتگی کے عالم میں خواب کے اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا۔ حضرت عباسؑ علمدار کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ شہدائے کربلا کے ضمن میں ان کا نام سنی حلقوں میں غیر معروف ہے اور چونکہ شعور و آگہی کا ایک طویل

لہ اس کتاب کا اردو ترجمہ خورشید خاور مکتبہ اصلاح سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اب تک متعدد ایڈیشن چھپ کر ختم ہو چکے ہیں۔

عرصہ اسی حلقے میں گزرا تھا اس لیے حضرت عباس بن علی بن ابی طالب کی جلالت شان اور رفعت قدر کا مجھے ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ تھا۔ ابھی شیعیت کی حلقہ بگوشی پر ایک سال بھی پورا نہ ہو پایا تھا۔ اس لیے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی۔

لیکن ابھی اس خواب کے واقعہ پر چار ماہ کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ توفیق الٰہی کی دستگیری نے مجھ بے سروسامان انسان کو کربلائے معلٰی کی خاک بوسی کا شرف بخشا۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے آستانہ شہادت پر آنسوؤں کا پورا ذخیرہ نذر کرکے جب حضرت عباس علمدار کے آستانہ عالیہ کی جانب روانہ ہوا تو طبیعت پر رقت و گداز کی ادنٰی سی کیفیت بھی نہیں تھی۔ طبیعت بالکل سپاٹ اور ہر قسم کے ارتعاش سے اک دم خالی ہو چکی تھی۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ خواب میں حضرت عباسؑ کے مزار مقدس پر گریہ و بکا کا جو منظر آنکھوں نے دیکھا تھا کہیں وہ تشنۂ تعبیر نہ رہ جائے۔ پھر خیال آیا کہ امام حسین علیہ السلام کے آستانہ قدس پر رونا اور حضرت عباسؑ کی بارگاہ میں آنسو بہانا ایک ہی بات ہے ؏

فعاعنی فھذا اکله قبر مالك

بہر حال سوچ کے ایسے تانے بانے بنتا ہوا صحن مقبرۂ حضرت ابوالفضل العباسؑ میں داخل ہوا۔ کچھ دیر وہاں رُک کر طبیعت کو گریہ و بکا پر آمادہ کرتا رہا۔ کبھی کربلا کی جنگ کا نقشہ ذہن میں لاتا کبھی شہدائے کربلا کی پیاس کا تصوّر باندھتا کبھی اہلبیتؑ کی مظلومیت کے واقعات ایک ایک کرکے ذہن کے سراپردوں پر ابھرتے کبھی "ھل من ناصرٍ ینصرنا" کی رقت انگیز صدا سماعت سے ٹکراتی، مگر گھٹا برس چکی تھی اور مطلع صاف ہو چکا تھا اسی اضطراب و پریشانی کے عالم میں رُکتا اور جھجکتا ہوا حجرۂ ضریح تک پہونچ گیا اجازت کے کلمات دہراتا اور اذن باریابی کی اُمید کرتا جب اندر داخل ہوا تو ہو بہو خواب کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا اور اب جو

آنسوؤں کا بند ٹوٹا ہے تو میں بچوں کی طرح بلبلا بلبلا کر رونے لگا اور اتنا رویا کہ آج تک آہ وزاری کی اس کیفیت پر رشک محسوس کرتا ہوں ۔ ع

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

سو میں اس کتاب کو خواب کے اس حیران کن واقعہ کی یاد میں قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس ع کی بارگاہ فضیلت مآب میں ایک حقیر نذرانے کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور ان کی، ان کے والد گرامی اور ان کے برادران ذی جاہ کی نظر کرم کا خواستگار ہوں۔

آنانکہ آب را گہر پر بہا کنند — آنانکہ باو را نفس جاں فزا کنند
آنانکہ نار را بہ نور و ضیا کنند — آنانکہ خاک بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بہ ما کنند

مؤلف

مقدمہ

شیعیت ایک مطالعہ ایک تجربہ

حرفِ آغاز | ایک ایسے پُر آشوب اور فتنہ پرور دور میں جبکہ خارجیت پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ سر اُٹھا رہی ہے۔ شیعہ حلقوں میں "وحدت" کی ہوائیں چل رہی ہیں اور رواداری برتنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ پسپائی اور خود سپردگی کا یہ انداز سنّی شیعہ روابط میں تلخی کو کم کرسکتا ہے۔ نہ اس سے شیعہ مسلک ہی کو کسی نوع کا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ قرآن مقدس نے بہت پہلے رواداری کے اس فریب کا پردہ چاک کیا تھا۔

"ولن ترضی عنك الیهود ولا النصاری حتی تتبع ملتهم قل ان هدی الله هو الهدی " "یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک خوش نہیں ہوسکتے جب تک آپ ان کے ملک و ملّت کو اختیار نہ کرلیں۔ آپؐ کہہ دیجئے راہِ راست تو صرف ہدایت خداوندی ہی کے ذریعے ممکن ہے"۔

حق و باطل کی کشمکش میں اپنی بات کھل کر نہ کہنا ایمان کی جان کنی ہے وقت کا تقاضا ہے کہ حق بات ڈنکے کی چوٹ کی جائے اور جسم و جان پر گزرنے والی آفتوں کی پروا نہ کی جائے۔

اس وقت سُنّی حلقوں کی جانب سے رد و ابطال شیعیت پر جتنی کتابیں

چھپ رہی ہیں ان کا انداز نہایت جارحانہ ہے۔ میں نے اس کتاب میں یہی انداز اپنایا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نہ شیعہ اس سے خوش ہوں گے نہ سُنّی۔ اگر کسی کو یہ رائے دم زدن ہے تو آئے اور اس کتاب کے مندرجات پر حرف گیری کرے۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغہ فاذا ھو زاھق ولکم الویل مما تصفون۔

شہید سید شاہد زعیم فاطمی رضوان اللہ تعالیٰ

۱۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء

مقدمۂ اوّل

دیباچہ قرطاس ابیض

دنیا جہان کا دستور ہے کہ جب کبھی کوئی حکمران ظلم و تعدی کا بازار گرم کرتا ہے اور اپنی ہی رعایا کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے لگتا ہے تو اس کی بساطِ اقتدار کے الٹ دیے جانے کے بعد ایسے ظالم حکمراں کی چیرہ دستیوں اس کے کرتوتوں اور اس کی بدعنوانیوں پر قرطاس ابیض (WHITE PAPER) شائع کیا جاتا ہے اور اس میں دستاویزی ثبوت کے ساتھ دنیا پر واضح کیا جاتا ہے کہ پیش رو حکمراں کس قدر گھناؤنے کردار کا حامل تھا۔

خلافت راشدہ جس کا آج دنیا میں ڈنکا بجایا جا رہا ہے۔ اپنی سفاکی اور ظلم و جبر کی بھیانک واردات کے اعتبار سے ایک ایسا دورِ حکومت اور عہدِ ستم رانی ہے کہ اس پر بھی ایک قرطاس ابیض شائع کرنے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ خلافت راشدہ جس نے اپنے تین خلیفوں کے زمانہ اقتدار میں اپنوں پر بھی شب خون مارے اور بیگانوں پر بھی تگ و تاز کی اس کا کچا چٹھا بیان کرنے کے لیے بھی ایک طویل دفتر درکار ہے۔

زیر نظر کتاب" پردہ اٹھتا ہے"، تو اس قرطاس ابیض کی ایک ابتدائی
جھلک ہے۔ اس (WHITE PAPER) کا اسے دیباچہ کہہ لیجئے۔
خلفائے ثلاثہ کی داستان جبر وتشدد کے لیے ایک الگ اور مستقبل
کتاب " خلافت راشدہ اور اس کا نظام حکومت" کے عنوان سے معرض
تحریر میں ہے جو اس موضوع پر حرفِ آخر ہوگی اور تب دنیا کو پتہ چلے
گا کہ جس نظام حکومت کو خلافت راشدہ کے پرفریب نام سے تعبیر کیا جارہا ہے
وہ انسانیت کی تذلیل کا ایک ایسا سیاہ دور تھا کہ اس کی خوں ریزیوں اور
سفاکیوں کے سامنے چنگیز و ہلاکو کی داستانیں اور روایتیں دم توڑتی
نظر آتی ہیں۔

پیغبر امن وانسانیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقدس
مشن کو اس عہد زبوں کار میں جس طرح پامال کیا گیا وہ تاریخ کا سیاہ
ورق ہے۔ اور اسے نہ تو جھوٹے پروپگنڈے سے نہ خود ساختہ جعلی
اور وضعی روایتوں جھوٹی تاویلوں کے بل پر جھٹلایا جاسکتا ہے۔ اس کی
سیاہ روئی میں کوئی کمی کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک شرمناک باب ہے کہ اگر کسی
دوسری قوم کی تاریخ میں اس قسم کا باب شامل ہوتا تو وہ شاید اجتماعی خودکشی
کے ذریعے اپنے دامن کے ان داغوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی
مگر کیا حوصلہ ہے مسلمان قوم کا کہ وہ دامن کے ان بدنما داغوں پر زندہ باد
کے نعرہ لگاتی اور خوشی کے مارے پھولی نہیں ساتی۔ کسی شخص کی بد طینتی
اور اس کے خبث باطن کے لیے یہی بات کیا کم ہے کہ وہ احسان فراموشی
کا مرتکب ہو۔ ساری دنیا کی نگاہ پر ایک احسان فراموش انسان سے بڑھ
کر کم ظرف اور فرومایہ انسان اور کوئی نہیں ہوتا اور کسی بھی مہذب معاشرہ

ہیں ایسے شخص کی اوقات دو ٹکے کی بھی نہیں ہوتی لیکن آپ دیکھیں کہ پیغمبرؐ کی جوتیوں کے صدقہ میں مسند اقتدار پر قابض ہونے والے لوگوں نے خود پیغمبرؐ کے خاندان سے کیا سلوک روا رکھا۔ کس طرح پیغمبرؐ کی اکلوتی بیٹیؑ کا حق غصب کیا کس طرح پیغمبرؐ کے نامزد کردہ جانشینؑ سے بدسلوکی کی کس طرح خانوادۂ نبوت کو اقتصادی مار مارنے کی ناپاک کوشش کی کس طرح ایک بدنہاد انسان لکڑیاں لے کر پیغمبرؐ کی لخت جگر کے مکان کو آگ لگانے پہونچا اور کس طرح اس نے اس موقع پر دہ اودھم مچایا کہ غنڈے اور بدمعاش بھی اس قسم کی ذلیل حرکتوں کا تصوّر نہیں کر سکتے لیکن بااین ہمہ آج وہی بدقماش لوگ مسلمان قوم کے ہیرو ہیں اور لوگ ان کے نام پر بغلیں بجاتے اور نعرے لگاتے ہیں۔

ڈرو غضب سے خدا کے تو ایک بات بھی ہے
نبیؐ کی غصہ میں ڈوبی ہوئی نگہ سے ڈرو

اور اس طرزِ حکمرانی پر داد کے ڈونگرے برسانے والے کون ہیں وہ جو پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اُس پر اور اُس کی آلؑ پر درود بھیجتے ہیں اور اس پیغمبرؐ کا نام نامی سن کر انگوٹھے چومتے ہیں لیکن انھیں کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی اگر ان کی اولاد سے کوئی ان کا نام نہاد دوست ایسی بدسلوکی کرے تو ایسے شخص کے بارے میں ان کا ردّ عمل کیا ہوگا۔

کیا محمدؐ عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کی وہ قدر و منزلت بھی نہیں جو خود ہماری اولاد کی ہماری نگاہ میں ہے کیا اسی کا نام محبت ہے۔

ابوبکر نے عمر نے عثمان نے عبدالرحمٰن بن عوف نے طلحہ نے اور زبیر نے خالدؓ بن ولید نے اور ابوہریرہ نے عبیدہ ابن جراح نے اور عمروؓ بن عاص نے جو بدمعالگی

دھاندلی، دھونس اور بے مروتی کی کیا اس کے بعد بھی ان لوگوں کی شان میں قصیدہ خوانی کا کوئی جواز باقی رہ جاتا ہے۔

کیا وفاداری کا مرکز و محور پیغمبرؐ کی ذات ہے یا کوئی اور۔

بس اس ایک بات پر سارے قضیہ کا فیصلہ ہوا چاہتا ہے، شرط یہ ہے کہ دل میں انصاف بھی ہو اور ایمان بھی۔

شاہد زعیم فاطمی

اپنی پہلی کتاب " سیدنا علیؑ ابن ابی طالب اور ان کے سیاسی حریف" کے پیش لفظ میں میں نے لکھا تھا۔

" اپنی تمامتر روسیاہیوں کے باوصف اور اپنے گناہ گار ہونے کے اعتراف کے باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان، ایک محب اہل بیتِ نبوتؐ نیز خانوادۂ بنو ہاشم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان بیہودہ الزامات اور بے سروپا اتہامات کی تردید کے لیے جو چند بدنہاد لوگ سیدنا علیؑ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، اور ان کی اولاد امجاد کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ اپنے قلم کو حرکت میں لاؤں

ایک عرصہ تک میں اس بیہودگی کے مظاہر کا بچشم خود مطالعہ کرتا رہا جو نام نہاد اہل سنت کی بعض ذمہ دار شخصیتوں کی جانب سے سرزد ہوتے رہے لیکن تا بہ کے؟ اب جبکہ ان " احبار سوء " کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس میں بھی ایسے لوگ ہٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو بدطینتی کے اس ناپاک کھیل کو سرِعام کھیلنے لگے ہیں اور تحقیق و تاریخ کے نام پر توہین اہل بیتؑ کا مذموم سلسلہ

چل نکلا ہے تو بادل ناخواسطہ ' کلوخ انداز را پاداشں سنگ است"
کے مصداق ضرورت محسوس ہوئی کہ ان چہروں سے نقاب سرکایا
جائے جنھیں اگر غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو پتہ چلے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

اس کے بعد "پردہ اٹھتا ہے" کے عنوان سے ایک اور کتاب کی ترتیب بھی ہمارے پیش نظر ہے جس میں ہم اہل سنت کی بعض نامور شخصیتوں اور اس گروہ کی کچھ ایسی نمایاں ہستیوں کے رخ کردار سے پردہ اٹھائیں گے جن کو آج تک عصمت انبیاء کا سا تقدس حاصل رہا ہے اور تب پتہ چلے گا کہ اہل سنّت جہاں کھڑے ہیں وہاں ان کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں ہے۔

انا صخرۃ الوادی اذا مازوحمت
واذا انطقت فاننی الجوزاء

آج اس کتاب کی صورت میں میں اپنی اس ذمہ داری کو پورا کررہا ہوں جو خدا و خلق کی جانب سے مجھ پر عاید ہوتی ہے۔

علیؑ ابن ابی طالبؑ اور انکے سیاسی حریف

علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے سیاسی حریف" کتاب پر حکومت نے پابندی عاید کردی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز" کے تحت اسکی اشاعت روک دی گئی گویا اب ماضی کی تاریخ کا تذکرہ بھی ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔

اپنی تاریخ پر وہی قوم پابندی عاید کرنے کا سوچتی ہے جسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا ماضی شرمناک ہے اور اقوام عالم کی صف میں اس کا کردار جگ ہنسائی کا موجب بنا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مسلمان قوم کی تاریخ ناسپاسی، ناشکر گزاری، احسان فراموشی اور بے مروتی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ نسل انسانی میں کسی بدترین سے بدترین قوم کا کردار ایسا گھناؤنا نہیں، جیسا کہ مسلمان قوم کا رہا ہے۔

خلافت کے لیے پیغمبر علیہ السلام کی دلی خواہش کو یکسر نظر انداز کردیا۔ پہلے اور دوسرے خلیفہ کے عہد اقتدار میں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے بدترین حریف قبیلہ کو برسرِ اقتدار لانے کی خفیہ اور منظم سازش کرنا اور تیسرے خلیفہ کے اپنے خاندان کے نااہل اور قابلِ نفرت افراد کو کلیدی عہدوں پر فائز کرنا اس قوم کے بعض ایسے کارنامے ہیں جن پر تاریخ کا ماتم آج بھی جاری ہے۔

خاندانِ نبوت کے ساتھ سرد مہری کا سلوک، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی اور چہیتی بیٹیؑ کے ساتھ بے مروتی کا برتاؤ، فیض یافتگانِ صحبتِ نبویؐ کی باہمی چپقلش اور ان کا قبائلی عصبیت کا مظاہرہ ایسے کارنامے نہیں ہیں کہ ان پر کوئی قوم فخر کر سکے۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری قوموں پر بدبختی کی یہ آفت پانچ سات نسلوں کے بعد آئی لیکن مسلمانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کی بدبختی کا آغاز ان کے پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہو گیا۔ دوسری قوموں نے جس سفر کا آغاز صدیوں بعد کیا مسلمانوں نے پہلے ہی دن اس راہ پر چلنا شروع کر دیا۔

"علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے سیاسی حریف" کتاب کیا شائع ہوئی "اہلِ سنت والجماعت" کے ایوان یزیدیت میں زلزلہ آ گیا اس گروہ کے لوگ انگاروں پہ لوٹ رہے ہیں ان کے ہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اور گویا ایک حشر برپا ہے کچھ لوگ تو اس بات پر تلملا رہے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والا شخص جس کے ددھیال اور ننھیال میں دور دور تک شیعیت کا سراغ نہیں ملتا۔ اس نے براہِ راست شیعی مکتبِ فکر کی حمایت کا ناقابلِ معافی جرم کیسے کیا اور کیوں کیا؟

بلاشبہ ماحول اور خاندانی اثرات کا انسان کے عقائد و اعمال پر گہرا اور دیرپا اثر قائم ہوتا ہے اور اگر توفیقِ الٰہی کی دست گیری شاملِ

حال نہ ہو تو انسان اس "تقلیدِ اعمیٰ" سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا اور خاندانی عقاید و نظریات کی بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکتا۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا واقعہ انقلاب حال کی تمہید بن جاتا ہے اور صدیوں کی مذہبی اور خاندانی روایتوں میں جکڑا ہوا انسان دفعتاً ان زنجیروں کو کاٹ پھینکتا ہے۔

"موسیو لیبیان" مشہور فرانسیسی دانشور کی کتاب "روح الاجتماع" میں آج سے تیس برس قبل جب یہ پڑھا تھا کہ "کسی خاص جماعت سے وابستگی کے دور میں انسان اپنے ذہن اور اپنے دماغ سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے"، تو اس وقت اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مشکل پیش آئی تھی لیکن جب "اہل سنت والجماعت" کی گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر تاریخ کا جائزہ لیا تو آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور پہلی بار اندازہ ہوا کہ اجتماعی نفسیات کے تحت عقل و شعور پر جو دبیز پردے پڑ جاتے ہیں ان پردوں کو اٹھانے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان دوسروں کے ذہنوں اور دماغوں سے کام لینے کی بجائے خود اپنے دل و دماغ سے کام لے اور حقائق کے ادراک میں خدائے دانا و بینا کی عطا کردہ علم و دانش کی روشنی سے استفادہ کرے اور خبیث و طیب میں خود امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

میری محولہ بالا کتاب دراصل حقائق تک رسائی کی ایک ابتدائی کوشش تھی۔ یہ کتاب تحقیق و تلاش و جستجو کا کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ نہیں تھا کہ "دشمن ایمان و آگہی" گروہ اس پر یوں سیخ پا ہوتا اس لیے کہ میں نے اسے ایک کتاب کی بجائے ایک سرسری احتجاجی مضمون کی صورت میں لکھا تھا اور موضوعِ بحث تھا

"یوم معاویہ" پر اظہار ناپسندیدگی۔

اگر اس کتاب کو علم و تحقیق کے انداز میں لکھنا مقصود ہوتا تو اس میں فکر و نظر کے دوسرے بہت سے مباحث بھی معرض تحریر میں آتے اور ایسا بیشتر علمی اور تاریخی مواد بھی اس میں شامل ہوتا جس سے امیرالمومنین سیدنا علی علیہ السلام کی قرار واقعی عظمت کو تحسین کا خراج شایان شان طریق پر پیش کیا جاتا۔

لیکن اس سرسری مضمون پر اہل سنت والجماعت کے حلقوں میں جو شدید ردعمل رونما ہوا اس نے جہاں اس فرقہ کی علمی بے بضاعتی اور تحقیقی بے مائیگی کا پردہ فاش کیا وہاں اس تلخ حقیقت کا بھی اندازہ ہوا کہ اپنی اکثریت کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا یہ فرقہ اپنی بھاری اکثریت کے باوجود اقلیتی فرقہ کے ایک عام سے احتجاجی نعرہ کا مقابلہ کرنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا۔ اور اس میں حقائق کا سامنا کرنے کی نہ جرأت ہے نہ ہمّت، وہ استدلال کے میدان میں کھڑا ہونے کی اہلیت سے یکسر محروم ہے اس کتاب کی اشاعت سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ اہل سنت خود اپنی کتابوں کے مندرجات سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور اگر ان کے سامنے صرف انہی کے مسلمہ و متفقہ کتابوں کا وہ رخ پیش کیا جائے جو اس فرقہ کی ممدوح شخصیتوں کے کردار اور چال چلن سے متعلق ہے تو یقین ہے کہ وہ ان شخصیتوں کے بتوں کو خود اپنے ہاتھوں توڑ دینے میں کوئی تامل نہیں کریں گے واقعہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو علم ہی نہیں ہے کہ انھوں نے جن لوگوں کو اپنے نہاں خانۂ دل میں سجا کر رکھا ہے کہ وہ کس قماش کے لوگ اور کس کردار کے انسان تھے۔ انھوں نے محض سنی سنائی باتوں کو جو ان کے "احبار سوء" اور رہبانان بد نے طوطے کی طرح رٹ رکھے ہیں عقائد کی صورت میں

قبول کر رکھا ہے اور اپنی بے سروپا باتوں کو وہ قرآن وحدیث سے زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صحیح واقعات رکھے جائیں اور انھیں ان کے خاندانی پس منظر میں ساری صورت حال سے آگاہ کیا جائے تو شاید ہی کوئی انصاف پسند اور معقول شخص ہوگا جو جائز حق داروں اور غاصبوں کے درمیان واضح فرق محسوس کیے بغیر رہ جائے

اس سلسلے میں خود اپنی مثال پیش کرتا ہوں کچھ عرصہ پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خلفائے ثلاثہ ابوبکر وعثمان وعمر کے بارے میں کوئی ایسی بات بھی کہی جا سکتی ہے جو تنقید وجرح کا پہلو لیے ہوئے ہو لیکن جب اہل سنت ہی کی کتابوں کے بے لاگ مطالعہ کا اتفاق ہوا تو عقل ودماغ پر پڑے ہوئے سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھ گئے اور تب نظر آیا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

خاندانی بندشوں سے بڑھ کر خرافات کا وہ طومار انسان کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے جسے ایک خاص منصوبہ کے تحت دور بنی امیہ و بنی عباس کے خود فروش اور بے ضمیر راویان حدیث اور فقہ نے مرتب کیا ہے۔

خرافات کے اس انبار میں اس حدیث کا بڑا چرچا ہے جو سراسر موضوع اور بے اصل ہے اور مشہور خارجی مصنف ابن تیمیہ تک نے اسے "من گھڑت" تسلیم کیا ہے[1]۔ لیکن سنی علما جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ حدیث وضعی اور جعلی ہے

---

[1] یہ حدیث بے بنیاد ہے (کتاب المنتقی ابن تیمیہ ص۵۵۱) اس روایت کے وضعی اور جعلی ہونے کے باوجود تم ہر چھوٹے بڑے سبھی اور متقین عظمت صحابہ کی اساس اسی جھوٹی روایت پر قائم کیے ہوئے مگر جوں کے توں قائم ہو۔

اسے بطور اسناد نہ صرف پیش کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے عقائد و اعمال کی اس کو اساس بھی قرار دیتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اصحابی کالنجوم۔ بایہم اقتدیتم اھتدیتم

میرے صحابہ ستارہ ہائے شب کی مانند ہیں تم ان میں سے جس کسی کا اقتدا کرو گے ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے۔

جعلی، وضعی اور من گھڑت حدیثوں پر جس مذہب کا دار و مدار ہو اور جن کے بڑوں نے پہلے پہل ایک جھوٹی حدیث وضع کر کے پیغمبرؐ کی آل کو اس کے آبائی ورثہ سے محروم کر دینے کی جسارت کی ہو وہ شرف وفضیلتِ صحابہ پر ایک نہیں بیسیوں حدیثیں گھڑ سکتے ہیں اور انھوں نے اس میں کوئی کمی نہیں کی۔

قرآن مقدس نے حضور ختمی مرتبت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "سراج منیر" یعنی آفتاب ہدایت، قرار دیا ہے اس آفتاب رشد و ہدایت کی موجودگی میں شب اور ستارہ ہائے شب کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں کہ اب ان کے بعد نہ کسی نبی کی ضرورت ہے نہ رسول کی اور وہ ایسی شریعت مقدسہ لے کر تشریف لائے جس کے بارے میں خود زبان نبوت و وحی نے یہ ارشاد فرمایا کہ۔۔۔

بعثت بسمحتہ ابیضا لیلہا کنہارہا

میں ایک ایسی بے لاگ کشادہ اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں جس کی رات بھی دن کی طرح اجلی ہے جب اس شریعت مطہرہ کے روز و شب اپنی تابانیوں کی رو سے یکساں ہیں تو ستاروں کی کیا تک ہے اور پھر تمام ستارگان شب رہ نمائی کے کام کہاں آتے ہیں، گنتی کے چند ستارے ہیں جن سے مسافران شب اکتساب ضیاء کرتے اور جن سے رہ نمائی حاصل کرتے ہیں ستاروں سے

سے کسب ہدایت کی ضرورت رات کی تاریکی میں ہوتی ہے دن کی روشنی
اور سورج کی موجودگی میں ستاروں کا کیا کام مگر گھڑنے والوں
نے اس قسم کی حدیثیں گھڑیں اور احمقوں نے انھیں آنکھیں بند کر کے
تسلیم کیا۔

تمہید

میں نے جب اپنی پہلی کتاب ,, مولائے کائناتؑ اور ان کے سیاسی حریف ,, لکھی تو اس وقت تک شیعہ مکتب فکر کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ میں صرف وہ کتابیں پڑھ کر بد مزہ ہوا تھا جو رسوائے زمانہ خارجی محمود احمد عباسی اور اس کی ذریت نے لکھیں اور جن میں خارجیت اور ناصبیت کا کھلم کھلا پرچار کیا گیا تھا۔ بہت سے ہیں اور کم ظرف مولویوں پر اِن کتابوں کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ان کی گز گز بھر کی زبانیں شیعوں کے خلاف زہر اگلنے لگیں اور بھرے جلسوں میں سیدنا علیؑ کی شخصیت و کردار پر کھلم کھلا تنقید ہونے لگی جیسے وہ خلفاءِ راشدین کے زمرہ میں شامل ہی نہیں ہیں اور جیسے گروہِ صحابہ میں سے انھیں خارج کر دیا گیا ہو۔

میری پہلی کتاب خارجیت کے ابھرتے ہوئے فتنے کے خلاف میرے ردعمل کا بالکل سطحی اور ابتدائی مظاہرہ تھا کیوں کہ تاریخ اسلامی کے نشیب و فراز سے میں پوری طرح واقف نہیں تھا۔ اس وقت تک شیعیت کے بارے میں بھی میرے دِل میں کسی قسم کا نرم گوشہ نہیں تھا تاہم یہ عجیب معجزہ رونما ہوا کہ عباسی وغیرہ کی کتابیں پڑھ کر خاندان بنی امیّہ کے خلاف میرے جذبات میں یک لخت تنفّر اور تکدّر کی لہر پیدا ہوئی اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ نورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اہلبیتِ نبوّت کے خلاف جو سازشیں بروئے کار لائی گئیں ان میں اس ملعون خاندان کا ہاتھ ضرور رہا خواہ فدک کے بارے میں ابوبکر کا غلط فیصلہ ہو، خواہ عمر ابن خطاب کا معاندانہ رویّہ ہو۔ خواہ عثمان

بن عفان کا متعصبانہ طرزِ عمل ہو۔ خواہ معاویہ کا اسلام دشمن کردار ہو۔

اسی دوران بالکل اتفاقی طور پر ایک اور واقعہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرے دل کی دنیا میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ حرم گیٹ ملتان میں اخباروں کے ایک اسٹال سے میں کراچی کے اخبار جنگ اور حریت خریدنے کے لئے جب وہاں پہنچا تو اس مقام پر رستہ رکا ہوا تھا۔ یہ محرم کی دسویں تاریخ تھی یعنی یومِ عاشورا، اور استاد اور شاگرد کے تعزیوں کا جلوس اس جگہ ماتم کناں تھا۔

میرے لیے تعزیہ کے جلوس دیکھنے کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ اس لیے حیرت واستعجاب کے ایک طرفہ احساس کے ساتھ ساتھ اس میں دلچسپی کا عنصر بھی شامل تھا۔

سینہ کوبی اور ماتم گساری کے اس ہنگامہ خیز ماحول میں اچانک میرے ذہن کے سراپردوں پر عربی ادب کی مشہور کتاب حماسہ کے یہ چار اشعار ابھرے۔ عربی ادب کی یہ نادرۂ روزگار کتاب برسوں سے میرے زیرِ مطالعہ وتدریس تھی اور اس کے سینکڑوں اشعار مجھے ازبر تھے۔ یہ چار شعر بھی مدتوں سے مجھے زبانی یاد تھے شاعر سلیمان بن قتتہ العدوی ہے جو امام حسین علیہ السلام کا معاصر ہے اور اس لیے اس کے اشعار میں دل گدازی اور غم گساری کی ایسی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس دن میرے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ میں ان شعروں کو بار بار دہرانے کی کوشش کرتا تھا مگر ہر بار پہلے مصرعہ پر ہی گلا آنسوؤں سے رُندھ جاتا تھا اور گریہ وبکا کا یہ عالم ہوا کہ ایک سُنّی عالم اور ایک علمی خانوادے کا فرد ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ اگر کسی سُنّی نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا تو میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

اخبار خریدے بغیر جب میں واپس لوٹا اور بھیڑ بھاڑ سے بچتا بچاتا اپنے آنسوؤں بھرے چہرے کو رومال سے چھپاتا ملتان کی تنگ وتاریک گلیوں میں سے ہوتا ہوا اپنے مکان کی جانب جارہا تھا تو یہ اشعار مسلسل میرا تعاقب کررہے تھے اور آنسو تھے کہ

تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

خدائے قدوس جزائے خیر عطا فرمائے ان اشعار کے شاعر کو جس نے میرے برسوں کے خوابیدہ ضمیر کو جگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میری سعادت و خوش بختی کا یہ گویا روز آغاز تھا اور توفیق الٰہی کی یہ عجیب کرشمہ کاری تھی کہ ان اشعار کی بدولت ہی میں زندگی میں پہلی بار غمِ حسینؑ کی لذت سے آشنا ہوا ۔

مررت علی ابیات آل محمد

فلم ارھا امثا لھا یوم حلت

فلا یبعد اللہ الدیار اھلھا

وان اصبحت عنھم برغمی تخلت

الا ان قتلی الطف من آل ھاشم

اذلت رقاب المسلمین فذلت

وکانوا غیاثا ثم اضحوا رزیہ

الا عظمت تلک الرزایا وجلت

۱۔ میرا گزر آلِ محمد (علیہم السلام) کے باوقار گھروں پر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان میں وہ پہلی سی چہل پہل باقی نہیں رہی۔

۲۔ اللہ نہ کرے کسی کا گھر ویران ہو اگرچہ خانوادۂ نبوت کے گھر تو میری آرزو کے برخلاف اجڑ گئے۔

۳۔ سن رکھو کہ میدان طف (کربلا) میں بنو ہاشم کے شہداء کے قتل سے مسلمان ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو گئے اور ان کی گردنیں جھک گئیں۔

۴۔ یہ لوگ کل تک دوسروں کے فریاد رس تھے آج خود ایک فریاد بن گئے ہیں۔ کیسا بڑا سانحہ اور کتنی دردناک مصیبت ہے۔

عاشورِ محرم کے اس حیران کن واقعہ کے فوراً ہی بعد ایک کباڑیے کی دوکان پر عربی کی ایک کتاب پڑی ہوئی ملی کتاب غیر مجلد تھی اور اوراق بوسیدہ کتاب کا نام تھا۔ "عبقریۃ الامام"، اور یہ مصر کے مشہور ادیب اور نامور مؤرخ عباس محمود العقاد کی تصنیف تھی بارہ آنے میں یہ کتاب خرید کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دولت کونین مل گئی ہو۔

جمادے چند وادم جاں خریدم　　بحمد اللہ بسے ارزاں خریدم

اس کتاب کے مطالعے سے میری سنیت کی ساری چولیں ڈھیلی ہوگئیں اور ذہن شیعیت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ "عبقریۃ الامام" امیر المومنین سیدنا علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کی سیرت طیبہ کا نقشِ جمیل ہے، اس میں مصنف نے جہاں سیدنا علی علیہ السلام کی شخصیت و کردار کا جائزہ لیا ہے۔ وہاں ان کے بعض حریفاں روسیاہ کی بدکرداریوں کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو پڑھا تو دل کے تمام دریچے امیر المومنین علیہ السلام کے لیے وا ہوگئے۔ اور دل و دماغ ان کی عقیدت و محبت سے سرشار ہوگیا۔ مجھے اس کتاب کے مطالعہ سے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ اسلامی تاریخ کی سب سے مظلوم شخصیت اگر کوئی ہے تو وہ صرف اور صرف امیر المومنین علی علیہ السلام کی ہے۔

یہ وہ حالات تھے جن میں میں نے پہلی کتاب لکھی۔ اس کتاب کی پذیرائی جو علمی حلقوں میں ہوئی اور جس طرح پڑھے لکھے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ سنت میرے درپے آزار ہوگئے اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۴۹ کے تحت جو ناقابلِ ضمانت تھی پولیس میرے پیچھے پڑگئی۔

بھٹو کا نمک حرام وزیر کوثر نیازی جو ان دنوں امور مذہبی کے محکمہ کا انچارج تھا اور جو اپنے عہدہ و منصب پر اپنی شاطرانہ بدفعلیوں کے سبب سنیوں سے زیادہ شیعوں

میں مقبول تھا اس نے اہلِ سنّت کے بعض بدنام مولویوں کے ایماء پر اس کتاب پر پابندی عائد کرائی اور کتاب کے ناشر کو بطور خاص اپنی ترک تازیوں کا نشانہ بنایا۔ داروگیر کے اس ہنگامے میں پولیس مجھے تو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی البتہ میرے دوستوں، عزیزوں اور قرابت داروں کی دکانوں پر، مکانوں پر، گھروں پر اور کاروباری اداروں پر "اشتہاری اور مفرور ملزم" کی تلاش کے پوسٹر چسپاں کیے گیے اور انہیں مختلف طریقوں سے ہراساں کیا جاتا رہا۔

میں نے یہ کتاب ہرگز اس نیت سے نہیں لکھی تھی کہ میں شیعہ ہونے جا رہا تھا۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اب مجھے اہل سنّت کے حلقوں سے دیس نکالا مل جائے گا اور مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔ لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ سعادتِ ابدی میرا مقدّر بنے سو بحمد اللہ اب میں پوری طرح مسلک شیعیت سے ذہناً اور قلباً وابستہ ہو چکا ہوں۔ تاہم میری اس کتاب کے خلاف سُنّی حلقوں میں جو طوفان اٹھا اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اہلِ سنّت کے ہاں دلیل اور معقولیت کا گزر نہیں اور ان میں اتنی استعداد بھی نہیں ہے کہ وہ ایک معمولی سی کتاب کا سامنا کر سکیں۔

میرا نسبی تعلق سادات کے ایسے خانوادۂ شرف و مجد سے ہے جو اَباً عن جدٍ مسند ارشاد و ہدایت پر فائز رہا اور جس میں بیعت و ارشاد کا سلسلہ صدیوں سے قائم ہے۔

میرے والد گرامی اور میرے نانا دونوں دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم تھے اور چونکہ دیوبندی مسلک میں پیری مریدی کا وہ روایتی جوش و خروش موجود نہیں ہے جو اہلِ سنّت کے دوسرے فرقوں میں متداول ہے اس لیے انہوں نے خاندانی روِش سے ہٹ کر زندگی بسر کی اور پیری مریدی کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔

شیعیت ہمارے خاندان میں شجرِ ممنوعہ رہی۔ اگر کبھی کسی رشتہ دار کے متعلق بہ طور افواہ بھی یہ خبر پھیلی کہ اس کا رجحان شیعیت کی جانب ہے تو خاندان بھر میں اس کا

حُقّہ پانی بند ہو جاتا ہے۔

میں نے جس ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی اس میں دو گروہوں کے بارے میں جذبات کا تناؤ حد سے بڑھا ہوا تھا ایک قادیانیت اور دوسرے شیعیت اور میں ایک مدّت تک ان دونوں فرقوں کو ایک ہی سطح پر رکھنے کا گنہگار رہا۔ میری تربیت کے بالکل ابتدائی دور میں مجھے جس فرقے سے سب سے زیادہ متنفر کیا گیا وہ یہی شیعہ فرقہ تھا۔ جس کا میں آج خود ایک سرگرم اور پُرجوش مبلغ ہوں۔

اسی دور کا ایک واقعہ میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔ ہوا یہ کہ میرے ننھیالی رشتہ داروں میں سے دور کے ایک بزرگ ہمارے یہاں فروکش ہوئے۔ ہمارے گھر میں آداب مہمان نوازی کی جس طرح رعایت محفوظ رکھی جاتی تھی اس کے برعکس ان صاحب کے لیے الگ برتنوں میں کھانا بھجوایا گیا۔ اور جب میں نے ازراہِ تعجب اس مختلف قسم کے سلوک کے بارے میں والدۂ محترمہ سے دریافت کیا تو انھوں نے بڑے حقارت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ یہ شخص شیعہ ہو گیا ہے اور شیعہ چوں کہ نجس ہوتے ہیں اس لیے انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانا یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس بدسلوکی کے جواز میں جو ایک شیعہ رشتہ دار کے ساتھ روا رکھی گئی یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ اگر کوئی سُنّی کسی شیعہ کے یہاں مہمان جاتا ہے تو شیعہ میزبان اپنے سُنّی مہمان کے کھانے میں غلاظت یا تھوک کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں سے پرہیز لازم ہے۔

بچپن میں تو میں نے اُسے امرِ واقعہ سمجھ کر تسلیم کر لیا مگر جب عقل و فہم سے کچھ بہرہ نصیب ہوا تو میں نے اسے محض ”دشمن کا پروپیگنڈہ“ سمجھ کر رَد کر دیا لیکن میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے مکتوبات شیخ الاسلام میں یہ عبارت پڑھی۔

”نہایت شہرت کو پہونچ چکا ہے کہ شیعہ اگر کسی سُنّی کو کھانا پانی دیتے ہیں تو اس میں نجاست ضرور ملا دیتے ہیں۔ اگر کوئی موقع نہیں ملتا تو تھوک

ضرور دیتے ہیں اس لیے حتی الوسع اس سے احتراز چاہیئے۔"

(ج ا ص ۳۰۱)

یہ ہے وہ انداز تحقیق اس بزرگ شخصیت کا جسے "عجم کا شیخ"، کہا جاتا ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنی سابق صدر نشین مسند تدریس دار العلوم دیوبند۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں میری پرورش ہوئی اور اس قسم کے بہت سے گفتنی و ناگفتنی واقعات نے شیعوں کے خلاف میری شدّت پسندی میں اضافہ کر دیا تھا۔ محرم کی سبیلیں، تعزیے، عزاداری کے دیگر مظاہرے، ماتم گساری کے مختلف روپ، ان سب کے بارے میں تنفر بڑھتا گیا اور شیعہ فرقے کے خلاف نفرت و تعصب کے جذبات تند و تیز ہوتے چلے گئے۔

تحریری صورت میں بھی یہ بات کہی جاتی رہی ہے لیکن اس وقت تک میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ البتہ "سینہ گزٹ"، کے طور پر یہ بات سُنی حلقوں میں عام شہرت رکھتی تھی کہ:۔

"جو لوگ ماتم کی اس "رسم بد" میں شریک ہوتے ہیں اور غم حسینؑ میں اشک افشانی اور سینہ کوبی کا ڈھونگ رچاتے ہیں یہ وہی گروہ ہے جس نے سیدنا حسین علیہ السلام کو شہید کیا تھا اور اب اپنی اس حرکت پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انھوں نے یہ دھندا اختیار کیا ہے۔

ایک اور بات جس نے شیعہ فرقے کے خلاف میری نفرت کو دوچند کیا وہ مردہ شخص کی بے حرمتی کا مسلسل پروپیگنڈہ تھا اور یہ بات زبان زد عام و خاص تھی کہ جب کوئی شیعہ مرجاتا ہے تو غسل میت کے موقع پر اس کے حصّہ اسفل میں "گز"، کیا جاتا ہے۔

---

[1] جب میں پہلے پہل جامع المنتظر کے شیعہ ماحول میں داخل ہوا تو یہ سوال رہ رہ کر

بہ الفاظ دیگر اس کی مقعد میں سلاخ پھیری جاتی ہے اور پھر اس غلاظت کو کھانے میں آمیزش کر کے امام حسین علیہ السلام کی نیاز دلائی جاتی ہے۔ باللہ

سوچتا تھا یا اللہ! یہ کیسے غلیظ لوگ ہیں۔ ان کے دین ومذہب کی بنیاد کیا ہے۔ ان کے عقیدہ عمل کی اساس کیا ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ بھی زوروں پر تھا کہ شیعہ کے معنی ہی نجس اور ناپاک کے ہیں۔ اگرچہ

میرے حاشیۂ خیال میں آتا رہا مگر نئی جگہ نیا ماحول جامع المنتظر کے پرنسپل مولانا صفدر حسین نجفی سے اس "گزکرنے" کی روایت کی توثیق کا کئی بار ارادہ کیا مگر حجاب مانع رہا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسے گندے اور شرمناک عمل کے بارے میں ان سے کیونکر سوال کروں اور یوں انھیں خفت اور ندامت میں مبتلا کروں۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ یہ گز کرنے کی بات کہاں تک مبنی برحقیقت ہے۔ مولانا نے فرمایا سراسر لغو اور بالکل غلط بات ہے۔ اور شیعہ فرقہ پر بہت بڑا بہتان ہے انہوں نے کہا ہمارے فرقہ کی کتابیں موجود ہیں ائمہ مجتہدین کے لکھے ہوئے رسائل بکثرت دستیاب ہیں ایک امکان جزئی کی حد تک بھی ایسا کوئی جزئیہ ہمارے فرقہ اور مسائل ورسائل میں مذکور نہیں ہے۔

عام مسلمانوں کے جنازے اور شیعیان علیؑ کے جنازے میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم میت کی دونوں بغلوں میں دو سبز شاخیں جن کے پتے الگ کر دیئے گئے ہوں کفن کے اندر رکھ دیتے ہیں کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب تک ٹہنیاں سبز رہتی ہیں ذکر و تسبیح میں مشغول رہتی ہیں اور اس کی برکت سے میت کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے لیکن یہ عمل بھی درجۂ استحباب میں ہے وجوب کے درجے پر نہیں ہے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اِن کو بہت ناگوار گزری ہے

میں عربی زبان سے واقف تھا اور لغت کی کسی کتاب میں شیعہ کے یہ معنی میری نظر سے نہیں گزرے تھے پھر بھی یہ خیال آتا تھا کہ عربی چوں کہ ایک وسیع زبان ہے اس یہ ممکن ہے یہ معنی بھی ہوں آخر ایسے معتبر لوگ کہتے ہیں تو جھوٹ تھوڑا ہی کہتے ہیں کچھ نہ کچھ حقیقت تو اس میں ضرور ہوگی۔

بچپن ہی سے عاشورہ محرم کی مجالس میں شرکت کی سخت ممانعت تھی اس لیے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان مجالس کے رنگ ڈھنگ کیا ہوتے ہیں اور ان مجالس میں کیا کہا اور کیا کیا جاتا ہے۔

یہ پروپیگنڈہ بھی زوروں پر تھا کہ آشور محرم کے ایام میں شیعہ لوگ کسی سُنی لڑکے کو اغوا کر کے اسے یزید کا بہروپ دے کر دسویں محرم کو قتل کر دیتے ہیں۔ اور یہ قتل اس اہتمام کے ساتھ عمل میں لایا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے جسم اطہر پر جتنے زخم لگے تھے یزید کے بہروپ کو بھی اتنے ہی زخموں سے ڈھیر کیا جاتا ہے۔

اس لیے دل میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ کہیں قرعۂ فال ہمارے ہی نام نہ نکل آئے یوں بھی ایک مذہبی گھرانے سے نسبت قرابت کی بناء پر ہمیں اپنے ذبح ہونے کے امکانات زیادہ نظر آتے تھے اس لیے ان مجالس سے دور ہی رہے ایک اور بات جس کا بڑا چرچا تھا عاشور محرّم کی رات یعنی شامِ غریباں کے سوگوار موقعہ پر مردوزن کے بے محابا اختلاط کی روایت تھی کہ اس رات کے، اندھیرے میں جو عورت جس مرد کے ہتھے چڑھ جائے وہ اسے بلاتکلف مصرف میں لے آتا ہے اور اس مباشرت کے نتیجے میں جو حمل قرار پاتا ہے اگر مولود لڑکا ہو تو مجتہد کی دستار فضیلت اس کے سر پر بندھتی ہے۔

جگر نگاری ماتم گساری، غم واندوہ، کی چاک وامانی اور رنج والم کی سینہ چاکی پر اس سے زیادہ ظالمانہ خندۂ استہزا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سُنّی مدارس کے نو دس سالہ نصاب تعلیم میں مسلک شیعیت یا فقہ جعفریہ کا کہیں ضمناً بھی تذکرہ نہیں آنے پاتا۔ گویا ذہناً اور عملاً اس مسلک کو اسلام کے مسلّمہ مکاتیب فکر میں سرے سے شمار ہی نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے کہیں اس موضوع پر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ نہ یہ پتہ چل سکا کہ شیعہ عقائد و اعمال کی اصل حقیقت کیا ہے اور سُنّی شیعہ نزاع میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور ان دونوں فرقوں کے درمیان کہاں کہاں اختلاف و افتراق کی خلیج حائل ہے۔ صدیوں سے یہ خلیج موجود ہے لیکن اہل سنّت جو سوادِ اعظم ہونے کے دعوی دار ہیں شیعیت کے بارے میں چند سطحی باتوں کے سوا کچھ نہیں جانتے اور یہ سطحی باتیں غلط سلط پروپیگنڈے کی رہین منّت ہیں جن میں حقیقت کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔

فقہ کی بعض کتابوں میں یا کتب حدیث میں یا عقائد و علم کلام کی بعض دستاویزی کتب میں سُنّی شیعہ نزاع سے متعلق کہیں کوئی ذکر آتا بھی ہے تو رواداری میں۔ فقہ حنفی کی مشہور اور سب سے معتبر کتاب ہدایہ میں ایک عبارت ہے۔

يجوز تقليد القضاء من السلطان الجائر كما يجوز من العادل لان الصحابه تقلدوا من معاويه

"ظالم حکمران کی جانب سے جج کا عہدہ قبول کرنا اسی طرح جائز ہے جیسے ایک انصاف پسند حکمراں کی جانب سے کیوں کہ صحابہ نے معاویہ کی جانب سے یہ منصب قبول کیا۔"

میں نے اس عبارت کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی مرحوم سے سوال کیا کہ :۔

"اس عبارت سے تو مترشح ہوتا ہے کہ معاویہ "سلطان جائر" (ظالم حکمراں) تھا۔ اگر وہ ظالم تھا جیسا کہ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی تصریح کر رہے ہیں تو معاویہ کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کا لاحقہ کیوں

استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا ایک ظالم حکمران کے لیے رضی اللہ عنہ کی دعا مانگنا جائز ہے؟"

مولانا اعزاز علی مرحوم بڑے تنک مزاج واقع ہوئے تھے فرمانے لگے:۔

"مولانا! (یہ ان کا تکیۂ کلام یا مستقل طرزِ تخاطب تھا جس سے وہ اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے تھے) آپ ہمیشہ بے تکے سوالات کرتے رہتے ہیں۔ رضی اللہ عنہ تو معاویہ کی صحابیت کی بناء پر ان کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ باقی رہا ان کا سلطان جائر ہونا تو یہ ایک الگ موضوع ہے"۔

معاویہ کے بارے میں فقہا کے اس ریمارک کے بعد کہ وہ ایک ظالم پیشہ حکمران تھا۔ یہ پہلا صحابئ رسولؐ تھا جس کے خلاف میرے دل میں نفرت کا جذبہ ابھرا۔ تاہم معاویہ کے ظالم حکمران ہونے کے علم کے باوجود ابھی شیعیت کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا اور میری جہالت کا یہ عالم تھا کہ دورۂ حدیث کا منتہی طالب علم ہونے کے باوجود مجھے یہ خبر نہ تھی کہ شیعہ فرقہ اور معاویہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ میں بیک وقت شیعیت سے بھی متنفر تھا اور معاویہ سے بھی۔

تاہم میں جب کسی شخص کو معاویہ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا اور بڑے بڑے علماء و فضلاء کو اس گھناؤنے جرم کا مرتکب پاتا تو میں فکر و نظر کے اس تضاد پر حیرت محسوس کئے بغیر نہ رہتا۔ ایک طرف قرآن مقدس کی بیشمار آیتیں میرے سامنے آتیں جن میں ظلم اور اہلِ ظلم کے سایے سے بھی بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور ظالموں کو لعنتِ خداوندی کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔

"وَلَا تَرْکَنُوا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ" (القرآن سورۂ ہود پ۱۲)

"ظالموں کی طرف ذرا سا بھی جھکاؤ اختیار نہ کرو کہ اس کی پاداش میں جہنم کی آگ تمہیں بھسم کر دے گی۔"

"الا لعنة اللہ علی القوم الظالمین"

"سنو! خدا کی پھٹکار ہے ظلم کرنے والوں پر"

"وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"

"ظالم لوگ بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ پلٹیں گے۔"

اور ایسی ہی بیشمار آیتیں ہیں جن میں ظالموں کی مذمت کی گئی ہے۔

دوسری طرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادِ عالیہ یاد آتے جن پر حضورؐ نے ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کی ہدایت فرمائی اور اسے جہاد کی سب سے اعلیٰ منزل قرار دیا:۔

"افضل الجہاد کلمہ حق عند سطان جائر۔"

"سب سے اعلیٰ وافضل جہاد کسی ظالم حکمران کے منہ پر سچی بات کہنا ہے"

من مشیٰ مع ظالم لیقویہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج عن دائرۃ الاسلام۔"

"جو شخص کسی ظالم کے ساتھ دو قدم چلا اور اس کی تقویت کا باعث بنا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ واقعتاً ظالم ہے تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا۔" (بیہقی)

لیکن یہ کیسی ستم ظریفی، اعجوبہ زائی اور طرزِ تماشگی ہے کہ نہ ظالم حکمراں ہونا ایک صحابی کے لیے عیب کی بات ہے نہ ظالم حکمراں سے تعاون کرنا شانِ صحابیت کے منافی۔ گویا صحابیت کا اعزاز ظلم کے ساتھ بھی قائم رہتا ہے اور ظالم کی علانیہ حمایت کے باوجود اس اعزاز میں کوئی قباحت رونما نہیں ہوتی۔ ایسا تقدس تو شاید پیغمبروں کو بھی حاصل نہیں ہوا اور ایسی عصمت کا تصوّر تو انبیاء و ملائکہ کیلئے بھی ثابت نہیں ہے مگر صحابی ہر حکم سے مستثنیٰ اور ہر قانون سے بالاتر ہے ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

میں جب دارالعلوم دیوبند میں قیام کے بعد واپس لوٹا تو اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ہمارے یہاں بعض نامور علماء کی تشریف آوری ہوئی۔ علماء کی اس مجلس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض عبارتیں زیر بحث آگئیں۔ مودودی صاحب نے اپنی کسی کتاب میں خلافتِ راشدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہیں یہ لکھ دیا، صحیح الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن اصل عبارت کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"شیخین کے بعد حضرت عثمان سریر آرائے خلافت ہوئے وہ ان خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے پیشرو حضرات میں پائی جاتی تھیں۔"

مولانا حسین احمد مدنی کا نام نہاد خلیفہ پیر خورشید احمد بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ اگرچہ جاہل مطلق تھا لیکن مودودی صاحب کی محولہ بالا عبارت پر تنقید میں سب سے پیش پیش تھا اور بار بار ایک ہی بات دہرائے چلا جا رہا تھا کہ اس فقرے میں مودودی صاحب نے حضرت عثمان کی خلافت کی خصوصیات کا انکار کیا ہے۔ بحث میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے میں نے ان جاہل واجہل پیر صاحب سے عرض کیا کہ:۔

"جب آپ ان حضرات میں فرق مراتب کے قائل ہیں کہ حضورؐ کے بعد سب سے افضل ابوبکر پھر عمر ہیں پھر عثمان ہیں تو یہ ترتیب خود بتا رہی ہے کہ خصوصیات میں کمی بیشی تھی۔ اور یہ تو ساری امت کا متفقہ فیصلہ ہے اس میں تن تنہا مودودی صاحب ہی تو مجرم نہیں ہیں۔"

بحث جب تلخی کا شکار ہونے لگی تو میرے نانا سید شریف حسن مرحوم نے مجھے ڈانٹا اور فرمایا۔

"بزرگوں سے بحث نہیں کیا کرتے تم خاموش رہو جی!"

بحث اس ڈانٹ ڈپٹ پر ختم ہوگئی لیکن میرے دل میں تاریخ کے مطالعہ کی

حِس پیدا کر گئی۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں از خود تاریخی واقعات کا جائزہ لوں۔ اور یہ معلوم کروں کہ وہ کون سی خصوصیات تھیں جن سے دامنِ عثمان تہی تھا اور جن کے باعث حالات ان کے قتل پر منتج ہوئے۔

انسان جب تک تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتا کنویں کا مینڈک بنا رہتا ہے اور بسم اللہ کے گنبد میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ سے ذہن و دل و دماغ کے بہت سے قفل خود بخود ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور یہی کچھ میرے معاملے میں ہوا۔

حضرت عثمان کے عہد خلافت پر تاریخ کی روشنی میں نظر ڈالی تو ایسی ایسی بدعنوانیوں کا حال پڑھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ ایک خلیفہ، راشد جسے بقول محدثین حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کا سرٹیفکیٹ بھی دے رکھا ہو ایسے کرتوت بھی کر سکتا ہے اور اس حد تک بھی جا سکتا ہے لیکن واقعاتی شہادتوں کا ایک انبار تھا جو حضرت عثمان کے اس غلط طرزِ عمل کی تائید و تصدیق کر رہا تھا۔

اور یوں عقیدت کا ایک بہت بڑا بت ٹوٹ گیا اور مجھے اس نام نہاد خلیفہ راشد سے نفرت ہو گئی۔ لیکن میری بے خبری اپنی جگہ بدستور قائم تھی۔ شیعیت کے خلاف میری نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دراصل مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ ردِّ عمل جس کا میں خود شکار ہو چکا تھا اسی کا نام تو شیعیت ہے یا یہ کہ شیعیت کے فروغ میں اس قِسم کے واقعات کا گہرا دخل ہے۔

شیعیت کے بارے میں میرا سطحی علم بس سنی سنائی باتوں تک محدود تھا اور میں اسے الحاد و زندقہ کی ایک تحریک سمجھتا تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی اور یہ کہ اس تحریک کا سرغنہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا تھا۔

ظاہر ہے کہ جہاں کسی تحریک کی نسبت کسی یہودی کی جانب کی گئی ہو وہاں اسلام

دشمنی کے علاوہ کونسا تصور ذہن میں ابھر سکتا تھا۔

میں نے اپنے ماضی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے صرف کتب تاریخ پر انحصار نہیں کیا بلکہ کتب حدیث بالخصوص "صحاح ستہ" کو بھی اپنے مطالعہ میں شامل کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ محض تاریخ کے مندرجات کی بناء پر اپنے خاندانی عقائد و نظریات سے دستکش ہو جاؤں۔

لیکن مطالعہ تاریخ کے اس پورے عرصہ میں شیعی مکتب فکر کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ چنانچہ میں نے تاریخ کا مطالعہ سُنّی مسلمان کی حیثیت سے کیا۔ شیعی مکتبِ فکر کی کتابیں اوّل تو سُنّی حلقوں میں دستیاب ہی نہیں تھیں اور جو دستیاب تھیں۔ ان کے بارے میں گمان یہی تھا کہ وہ کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں۔ اور یہ اس مسلسل پروپیگنڈے کا اثر تھا جو صدیوں سے شیعیت کے خلاف کیا جاتا رہا ہے۔

البتہ شیعوں کی مخالفت اور شیعی مکتبِ فکر کے رد میں لکھی جانے والی بعض کتابیں ضرور میرے زیرِ مطالعہ رہیں اور ان سے میں خاصا متاثر بھی ہوا۔

بہت عرصہ پہلے جب میری عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہیں تھی اور میں ایک دینی مدرسہ میں مشکوٰۃ، جلالین اور ہدایہ کا طالب علم تھا۔ مشہور سُنّی مناظر مولانا عبدالشکور لکھنوی ہمارے یہاں تشریف لائے اور جاتے ہوئے اپنی بہت سی تصنیفات ہمارے والدِ گرامی کو بہ طور تحفہ دیتے گئے۔

ہمارے گھر میں ایک معزز اور بزرگ مہمان اور نامور عالم دین کی حیثیت سے ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور پہلی بار ایک ایسی شخصیت کو دیکھنے کا موقع ملا جسے "امام اہلِ سنّت" کے بھاری بھرکم لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور شیعیت کے لیے ان کے وجود کو ایک دھماکہ سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مولانا موصوف نے جو کتابیں ہدیۃً پیش کی تھیں ان میں ایک کتاب کا نام حافظ

بطور خاص محفوظ رہا۔ اس کتاب کا نام تھا "تبنیہ الحائرین"۔

یہ پہلی کتاب تھی جو ردِ شیعیت کے موضوع پر میری نظر سے گزری۔ اس کتاب میں مناظرانہ نوک جھونک اور حریفانہ بحث و جدل کا انداز اس نو عمری کے دور میں جبکہ ذہن ابھی خام تھا مجھے خاصا دلچسپ محسوس ہوا۔ اب اس کتاب کے تمام مندرجات تو ذہن میں نہیں رہے لیکن اس میں درج ایک لطیفہ جسے کثیفہ ناپاک جسارت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان دنوں میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ اور بہت دنوں تک اسے دہراتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

یہ دراصل سُنّی اور شیعہ مناظروں کی نوک جھونک کا ایک فرضی قصہ تھا جسے "امام اہلسنّت" نے شیعوں کو چڑانے کے لیے اپنے خبثِ باطن کے اظہار کے لیے گھڑا تھا۔

سُنّی مناظر شیعہ عالم سے کہتا ہے۔

"مگر آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ قرآنِ پاک میں یزید کی بڑی تعریف ہے آپ نے وہ آیت دیکھی ہے!؟"

"شیعہ عالم :۔ اجی تو بہ کیجیئے یزید نزولِ قرآن کے وقت تھا بھی نہیں۔"

"سُنّی مناظر :۔ ہم یہ کچھ نہیں جانتے اس سے ہم کو کچھ بحث نہیں ہم تو اس آیت میں صاف صاف یزید کا نام دیکھتے ہیں۔"

"شیعہ عالم :۔ اچھا جناب! وہ آیت کون سی ہے؟

سُنّی مناظر :۔ لیجیئے "ونزیدھم من فضلہ" اور یزید ان کا خدا کے فضل سے ہے۔ یعنی بنو امیہ کا یزید خدا کے فضل سے پیدا ہوا ہے یا حاکم ہوا ہے۔

شیعہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ میری دھاندلی کا جواب ترکی بہ ترکی ہے بس پھر تو ایسے خاموش ہوئے کہ .

فبهت الذی کفر کانه التقم الحجر کا فریمکا بکا ہو گیا اس نے پتھر نگل لیا ہو۔

میں نے یہ عبارت جب اپنے استاد محترم مولانا عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کو سنائی تو وہ بہت بدمزہ ہوئے فرمانے لگے۔

"اہلِ بیت و نبوت کے بدترین دشمن کی تعریف و توصیف کے لیے قرآنِ پاک میں لفظی اور معنوی تحریف کی یہ جسارت کس خبیث نے کی ہے؟"

مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند میں میرے والد ماجد نور اللہ مرقدہ کے رفقائے درس میں سے تھے اور عربی ادب میں خصوصی دستگاہ کے حامل تھے۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ یہ عبارت کسی اور کی نہیں "امام اہلِ سنت" کی ذہنی اختراع ہے تو وہ بیساختہ بولے۔

"ان صاحب کی نظر سے قرآنِ پاک کی یہ آیت نہیں گزری کہ

ویزید هم طغیانا وکفرا

جس میں امام اہلِ سنت کے استدلال کی رو سے یزید کی نسبت طغیان و کفر و سرکشی کی جانب کی گئی ہے۔ پھر استاد محترم نے تادیب و تنبیہ کے انداز میں فرمایا:

"اس قسم کی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی بہ طور مزاح بھی جائز نہیں ہے کہ اس سے احترام قرآن کی روح بھی مجروح ہوتی ہے اور اس سے توہین اہلبیت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔"

تو روشیعیت میں ایسی کئی کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں جن میں اسی عرصہ تک اس کی بھنک کانوں میں نہیں پڑی نہ یہ پتہ چل سکا کہ حضورؐ کے وصال کے بعد اس مسئلہ نے کیسی سنگین نوعیت اختیار کر لی تھی اور بعض نامور صحابہ نے اس باغ فدک کے معاملہ میں کیا کردار ادا کیا اور اس باغ کی ملکیت کی دعوے دار حضرت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا پر کیا گزری۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض کر دوں کہ ہمارے دینی مدارس میں کتبِ حدیث کو سبقاً سبقاً ایک ایک حدیث کی تشریح و توضیح کے ساتھ پڑھانے کا معمول کبھی نہیں رہا۔ حدیث کی وہ چھ ضخیم کتابیں جنھیں "صحاح ستہ" کہا جاتا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں :

بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔

انہیں ایک ہی سال کے اندر اندر شروع سے لے کر آخر تک پڑھانا ہوتا ہے۔ اس لیے علاوہ دورِ حدیث میں موطا امام مالک اور موطا امام محمد بھی دورۂ حدیث میں شامل ہیں اس لیے تدریس کا انداز یہ اختیار کیا گیا ہے۔ استاذ مسندِ تدریس پر براجمان ہے۔ متعلقہ کتاب اس کے سامنے کھلی رکھی ہے۔ طلبہ کے سامنے بھی کتابیں دھری ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک طالب علم بڑی روانی کے ساتھ متن مع حدیث پڑھتا چلا جاتا ہے اس مقصد کے لیے عموماً کسی ایسے طالب علم کا انتخاب کیا جاتا ہے جو تیزی سے اور اعراب کی کسی قدر صحت کے ساتھ عبارت پڑھ سکتا ہو دوسرے طلبہ گم صم بیٹھے رہتے ہیں یا اپنے خیالوں میں مگن استاذ کبھی پان چبانے میں مصروف اور گھر کی سوچوں میں گم، استاذ شاگرد سب بظاہر درس میں شریک مگر بہ باطن حلقۂ درس سے کوسوں دور۔ نہ استاذ کو کچھ خبر کہ کیا پڑھا جا رہا ہے، نہ طلبہ کو کچھ معلوم کہ کیا پڑھا جا رہا ہے اور جو کچھ پڑھا جا رہا ہے اس کا مطلب و مفہوم کیا ہے۔

ع کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

کبھی کبھار کسی ایسے موقع پر جب ائمہ اربعہ (مالک۔ ابوحنیفہ۔ شافعی۔ احمد بن حنبل) میں سے کسی کے موقف کی تردید یا تائید مقصود ہو تو شیخ الحدیث صاحب لب کشائی فرماتے اس کے سوا ان کا اور کوئی مصرف نہیں۔۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کے مضامین یا ان کی صحت و سقم کے بارے میں طالب علم روزِ اول ہی کی طرح بے خبر

رہتے۔ جب کوئی اس قسم کی اختلافی حدیث کتاب میں آجائے کہ اذا کان السماء قلتین لم ینجسہ شیء جب پانی کی مقدار دو "قلہ" ہو تو اسے کوئی شے ناپاک نہیں کرسکتی؟ تو محدث صاحب اس موقع پر کچھ دیر داد ندریس دیتے "قلہ" کی لغوی اور فقہی تشریح کرتے ہوئے مخالف فقہاء کے لتّے لیتے اور پھر استغراق میں تشریف لے جاتے۔

درس نظامی کی ترتیب کچھ اس طرح رکھی گئی ہے کہ جو مضمون سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اسے سب سے کم وقت دیا جاتا ہے۔

قرآن مقدس تمام دینی علوم و معارف کا سرچشمہ ہے لیکن اسے تفسیر کی صرف ایک یا دو ادھوری کتابوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اور وہ تفسیر بھی "جلالین شریف" ہے۔

ذرا اس کتاب کے مؤلف کے مبلغ علم اور اس فاضل مفسّر کی علمی بے مائے گی کا اندازہ کیجیے کہ قرآنِ پاک کے پہلے پارے کی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسر صاحب کیا دور کی کوڑی لائے ہیں آیت ہے:۔

واذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما۔

"جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ ہر آزمائش میں پورے اترے تب پروردگار نے ارشاد فرمایا۔ "میں تمھیں نسلِ انسانی کا امام مقرر کر رہا ہوں۔"

مفسر صاحب اس آیت کی شرح میں ان باتوں کی فہرست گنواتے ہیں جن میں ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے آزمایا تھا وہ ہیں ناخن تراشنا، ختنہ کرانا، موئے زہار یعنی موئے زیرِ ناف کی پاکی، مونچھیں کتروانا، بغل کے بال صاف کرانا۔

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت، ان کے ایثار و قربانی، ان کی ذات و حمیت، ان کی حق گوئی اور حق پژوہی، ان کا صبر و ثبات، ان کی تسلیم و رضا کی چند اور چند ملکوتی صفات کے ذکرِ جمیل کے بجائے ان کو ایک نائی حجام کے روپ میں پیش کرنا ہمارے ان فاضل مفسر صاحب کا کمال فن ہے۔

اور یہ مفسّر کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ اپنے دَور کے "امام اہلِ سنّت" اور نویں صدی ہجری کے مجدد علامہ جلال الدین سیوطی ہیں۔

جب قرآن مقدّس کی تفسیر کا یہ عالم ہے تو حدیث کی جو درگت بن جائے کم ہے۔

میں نے جب کھلی آنکھوں اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ قرآن و حدیث کا مطالعہ شروع کیا تو احساس ہوا کہ زندگی کا بیشتر حصّہ جہالت و بے خبری میں گزر گیا۔ کتنے حقائق نظروں سے اوجھل رہے اور کتنے ہی غلط نظریات و عقائد دل و دماغ کا احاطہ کئے رہے۔

ع وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

آیئے! اب کچھ باتیں اس غلط سلط پروپیگنڈے کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ جو مدتِ مدید سے شیعہ مسلک کے خلاف زباں زد ہے اور جس میں روز بہ روز شدّت پیدا ہو رہی ہے۔

اس مسلک سے قریب آ کر اور اس کا تحقیقی اور علمی جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ چوں کہ صدیوں سے "قلم در کف دشمن است" کی صورتِ حال سے ہماری تاریخ دوچار ہے۔ اس لیے جب تک اصل صورتِ حال آشکار نہ ہو شیعہ فرقہ سے انصاف مشکل ہے۔ سو انصاف کا تقاضا ہے کہ ان اعتراضات کی چھان پھٹک

کریں جو اہلِ سنّت کی جانب سے اہلِ تشیع پر وارد کیے جاتے ہیں۔

شیعوں کے خلاف اہلِ سنّت کے حلقوں میں جو پروپیگنڈہ مہم جاری ہے اس میں بطور خاص یہ بات پھیلائی جا رہی ہے کہ شیعہ توحید خداوندی کے قائل نہیں ہیں اور ان کے عقیدہ وعمل میں شرک کی جڑیں بہت گہری اتری ہوئی ہیں بالخصوص دیوبندی اور اہلِ حدیث تو اس الزام تراشی میں تمام حدود وشرافت سے تجاوز کر گئے ہیں۔

بریلویوں پر ان دونوں مقدم الذکر گروہ کی جانب سے بڑا الزام ہی یہ ہے کہ وہ مشرکانہ عقائد واعمال میں مبتلا ہیں لیکن شیعوں کے معاملے میں دیوبندیوں، بریلوی، اہلِ حدیث دونوں ہی "سگ زرد برادر شغال" کے مصداق یہ بہتان باندھتے ہیں کہ شیعہ صرف اپنے بارہ اماموں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور خدا اور رسُول کی تو ان کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

میں بھی مدتوں اس پر فریب اور سراسر جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار رہا لیکن جب شیعہ مسلک کے قریب آیا تو پتہ چلا کہ شیعہ عقائد واعمال میں توحید کی اساس اتنی مضبوط ومحکم ہے کہ کسی اور کے ہاں یہ استواری نہیں ہے اور سب سے زیادہ اگر کوئی گروہ شرک وبدعت وبت پرستی میں مبتلا ہے تو وہ بھی گروہ اہلِ سنّت ہے۔

آیئے ایک نظر اہلسنّت کے تصور خدا پر بھی ڈال لیں۔ شیعوں کی بات تو بعد میں ہوگی۔

دیوبندیوں کے عقیدہ کے مطابق "امکان کذب باری"، ایک امر واقعہ ہے جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام عیوب ونقائص بشری جو انسانی کمزوریوں اور خامیوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ حق تعالیٰ بھی ان سے متصف ہو سکتا ہے اور بوقت ضرورت یہ برائیاں اس کے اندر بھی پائی جا سکتی ہیں۔

ذات حق کی اس سے زیادہ توہین کیا ممکن ہے۔

یہ اسی بدعقیدگی کے برگ و بار ہیں کہ ان کے ہاں پڑھے جانے والے ایمان مفصل میں "شر" یعنی برائی کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی جانب کی گئی ہے۔

والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ ان کے عقیدے کا جزو ہے گویا خدا سے شر کا صدور نہ صرف ممکن ہے بلکہ محقق ہے اور اس بدعقیدگی میں اہلسنّت کے تمام گروہ ملوّث ہیں۔

حق تعالیٰ جو مصدر و منبع خیر و سراسر خیر ہے اس کی جانب شر کی نسبت ایک ایسی گستاخی اور سوء ادبی ہے کہ اس کے بعد توحید کا تصور ہی باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا آسان اور سادہ و سلیس زبان میں مطلب یہ بنتا ہے کہ خدا شرارت بھی کرتا ہے اور عیاذاً باللہ اس اعتبار سے اس کا ایک نام شریر بھی ہوا۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

تجسیم باری تعالےٰ کا عقیدہ بھی اہل سُنّت ہی کے ایک گروہ میں مقبول ہے اور ان کے ہاں اس قسم کی بکثرت روایتیں ملتی ہیں کہ خدا کے عرش پر متمکن ہونے کی صدائے بازگشت ملاء اعلیٰ میں صاف سنائی دیتی ہے جب وہ اپنے تخت جلال و کبریائی پر فروکش ہوتا ہے اور عرش پر نزول اجلال فرماتا ہے تو اس قسم کی آوازوں کا شور بلند ہوتا ہے جیسے چوبیں تختہ یا لکڑی کی کرسی یا بانس کی چارپائی پر ایک بھاری بھرکم وجود کے بیٹھنے سے ہوا کرتا ہے۔

دیوبندیوں میں ایک بہت بڑا عالم گزرا ہے مولوی حسین علی نام کا میانوالی ضلع کا ایک پسماندہ اور دور افتادہ مقام واں بھچراں اس کا مسکن تھا۔ یہ شخص دیوبندی مکتب فکر کے نامور بزرگ مولانا رشید احمد گنگوہی کا تلمیذ خاص تھا خود اس کے پیروکاروں کی ایک کثیر تعداد پاکستان میں موجود ہے اس کے شاگردوں میں دو نام تو بہت معروف ہوئے۔ ایک مولوی غلام اللہ خاں راولپنڈی جو اب مر چکا ہے۔ دوسرا

سید عنایت اللہ شاہ بخاری جو ابھی تک بقید حیات ہے۔ اس شخص کو جو توحید کا ہیضہ ہوا تو اس نے نہ صرف حیاۃ النبیؐ کے مسلمہ عقیدہ کا انکار کیا بلکہ توسل کو حرام قرار دیا اور اپنی تفسیر قرآن میں "طاغوت" کی تشریح کرتے ہوئے اس لفظ کے مفہوم میں انبیاء و ملائکہ تک کو شامل کر گیا۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے "بلغۃ الحیران"، طبع اوّل) یہ شخص ہندوستان میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کا بروز تھا اور اس نے عشق و محبت رسولؐ اور ادب و احترام کی تمام قدروں کو شرک قرار دے دیا۔

توحید خداوندی میں شرک کی ادنیٰ آمیزش ناقابل معافی جرم ہے لیکن ادب و احترام ہرگز توحید کے منافی نہیں ہے اور تعظیم کو شرک کے مترادف قرار دینا دین میں تحریف بھی ہے اور غلو بھی جس سے قرآنِ مقدس نے بڑی سختی سے روکا ہے۔

شعائرِ الٰہیہ کی تعظیم کو قرآنِ مقدس نے دلوں کی کیفیت کو تقویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب خدائے بزرگ و برتر نے صفا اور مروہ کی دو برائے نام پہاڑیوں کو شعائر اللہ میں شمار کیا ہے۔ اگر ناقہ صالح شعائر خداوندی بن سکتی ہے اور اگر صفا و مروہ کی پہاڑیاں شعائر اللہ میں شمار ہو سکتی ہیں تو پیغمبرؐ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل اطہار کو اگر شعائر خداوندی میں شمار کیا جائے اور ان کے عتبات عالیہ کی تعظیم و تکریم کا اہتمام کیا جائے تو یہ شرک کیوں کر ہوا؟

وہ پتھر جس پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے نقش پا ثبت ہیں اور جسے قرآن مقدس نے مقامِ ابراہیمؑ کا نام دیا ہے اس کے لیے حکم ہوا کہ اسے مصلیٰ بنایا جائے۔

اور بڑے سے بڑا موحد بھی خانہ کعبہ کے اس مقامِ مقدس کے سامنے دو نفل کی ادائیگی کو اجر و ثواب سمجھتا ہے۔ کیونکہ خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہاں نماز ادا فرمائی۔

اگر ابراہیم علیہ السلام کے نقش کف پا کو اپنی جبین نیاز کے روبرو رکھنے سے اور

اس کے سامنے کھڑے ہونے سے رکوع وقیام سے شرک کا اشتباہ نہیں ہوتا تو اہلِ بیتِ نبوت کے مزارات پر کھڑے ہو کر ان پر درود وسلام بھیجنے یا ان کے توسل سے بارگاہِ ایزدی میں دعا والتجا سے شرک کا امکان کیسے پیدا ہوا؟

قرآنِ مقدس نے جہاں کعبہ کی حرمت وعظمت کا بیان کیا وہاں یہ بھی کہا کہ فیہ اٰیات بینات مقام ابراھیم اس حرمِ کعبہ میں خدا کی دی ہوئی اور روشن آیات ہیں اور وہ ہیں مقام ابراہیمؑ۔ یہاں مقامِ ابراہیمؑ کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا حالانکہ ایک ہی چیز ہے جس کا آیت میں تذکرہ ہے لیکن نہیں ابراہیمؑ کے دونوں قدموں کے نشانات اور وہ پتھر جس پر یہ نقوش پا ثبت ہیں مل کر تین ہوئے اور اس لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

توسل کے باب میں قرآنِ مقدس کی دو آیتیں اس کے جواز میں اس کے وجوب واستحسان کی تائید کرتی ہیں۔ پہلی آیت چھٹے پارے کی ہے۔

یاایھاالذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ (مائدہ پ۶)

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک رسائی کا وسیلہ تلاش کرو۔

وہابیت کے دل دادہ اس آیت میں لفظ "الوسیلہ" کے سلسلے میں تاویل کو تحریف کا رنگ دے کر اس سے "عمل صالح" مراد لیتے ہیں۔

لیکن قرآن مقدس اپنے مفہوم ومعنی بھی خود ہی متعین کرتا ہے چنانچہ ایک دوسری آیت میں ارشادِ ربانی ہے:

اولٰئک الذین یدعون یبتغون الیٰ ربھم الوسیلۃ انھم اقرب ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ (بنی اسرائیل پ۱۵)

وہ لوگ (اہل ایمان) دعا کرتے ہیں اور وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ لوگوں میں کون ایسا ہے جو خدا سے قریب تر ہو (تو اس کا دامن پکڑیں) اور خدا کی رحمت

کی امید لگائے ہوئے ہیں اور اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

یہاں حق تعالیٰ نے الفاظ کا انتخاب ایسا کیا ہے کہ وہابیت کی جڑ کٹ کر رہ گئی ہے۔ "ایھم"، میں ضمیر "ہم" کا مرجع ذوی العقول یعنی انسان ہو سکتے ہیں عمل صالح نہیں۔ اگر عمل صالح مراد ہوتا تو "الوسیلہ" کی مناسبت سے "ایھا" کا لفظ آتا۔

یہ عربی گرائمر کا بالکل ابتدائی سا سبق ہے اور کسی نو آموز عربی خواں سے بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں وضاحت کے ساتھ اپنی دعاؤں میں مقربانِ بارگاہِ حق کا وسیلہ پکڑنے کا تذکرہ موجود ہے اور کوئی نہایت کور ذوق اور کودن ہوگا جو اس آیت کی موجودگی میں توسل کو شرک سے تعبیر کرنے کی حماقت کرے مگر جنھیں توحید کا ہیضہ لاحق ہو ان کی بیماری کا کیا علاج۔

چنانچہ اُمّت محمدیہ کے جمہور علماء و مفسرین کا اس امر پر اتفاق رہا ہے کہ دعاؤں میں توسل مستحب و مسنون ہے اور گویا عربی کے اس شعر کی عملی تشریح ہے ؎

احبّ الصالحین و لست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

میں نیکو کار لوگوں سے محبت رکھتا ہوں گو خود ان میں سے نہیں ہوں۔
شاید نیک لوگوں سے محبت میرے نیک ہونے کا سبب بن جائے۔

بندگانِ حق سے محبت بجائے خود ایک عمل صالح ہے اور اگر عملِ صالح ہی وسیلہ نجات ہے تب بھی توسّل کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

مگر ابن تیمیہ اور اس کی ذرّیت نے اور محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس کے پیروکاروں نے ایک سیدھے سادے مسئلہ کو شرک و بت پرستی سے تعبیر کر کے اختلاف و افتراق کی ایک نئی راہ پیدا کر لی اور مفسدین و اشرار کو فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کا ایک اور سنہری موقع مل گیا۔

اُمت کا دامن انہی شر پسندوں کی چیرہ دستیوں سے تار تار ہے جو اپنے ذہن کی ہر کجی کو شریعت کا روپ دے کر شریعت کو بازیچۂ اطفال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

ہر لیمئے دار دیں شدہ

راقم الحروف کو حسنِ اتفاق سے آئمہ معصومین علیہم السلام کے عتبات عالیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جن آئمہ علیہم السلام کے مزارات مقدسہ وہابی دست برد سے محفوظ ہیں ان کے قبوں سے باہر ایک بڑے سے فریم میں اذنِ باریابی کی جو دعا لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس دعا کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ مسلک شیعیت میں توحید کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ ہر مقام پر لکھی ہوئی دعا کی عبارت میں یہ فقرہ موجود ہے۔

(خداوندا! میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں تیرے اس نیک بندے کے وسیلہ سے)

توسل کو شرک قرار دینا انہی بد مذاق لوگوں کا اندازِ فکر ہے جو نہ توحید کی حقیقت سے واقف ہیں نہ توسل کے آداب سے۔

خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادعیۂ ماثورہ میں بعض ایسی دعائیں ہیں جن میں انبیاءؑ سابقین کا توسل مذکور ہے۔ ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں۔

اے اللہ! اے عیسیٰؑ کے رب، اے موسیٰ کے رب، اے ابراہیم کے رب اور اے محمدؐ کے رب!!

اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اس سے بلند وارفع ہے کہ انہیں توسّل کی حاجت ہو مگر امّت کو تعلیم دینے کے لیے حضورؐ نے دعائیہ اسلوب اختیار فرمایا۔ یہ عجب بات ہے کہ اگر شیعیانِ علی علیہ السلام ائمہ اہلِ بیت طاہرین سے توسل

کریں تو اس پر فوراً شرک کا فتوےٰ عائد کر دیا جائے لیکن اگر اہلسنت ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی تعداد کے اپنے پیروں، مرشدوں اور ایروں غیروں کا وسیلہ پکڑیں تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔

اہلِ سنّت کے اماموں، پیروں، مرشدوں اور مشائخ طریقت کی تعداد لاکھوں سے تجاوز ہے یعنی ؏

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کا مضمون ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کا امام، ان کا مقتدا، ان کا پیشوا اور اس طرح ان کا وسیلہ بننے کا اہل ہے

بہ ذرہ ذرہ سجودے نصیب ما شدہ است
بگو ندیم کہ اکنوں بہ برہمن چہ رسد

ذرا ان بزرگانِ دین کے القاب و خطابات ہی کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو ابکائی ہونے لگتی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ آستانۂ ہدایت سے جو صحیح معنوں میں امتِ محمدیہ کے لیے "عروۃ وثقیٰ" تھا منحرف ہو کر کس درجہ آشفتہ خاطری کے شکار ہوئے کہ اب ہر سنگِ در ان کے لیے عبادت گاہ بن گیا ہے۔ اہلِ سنّت کے دینی پیشواؤں اور روحانی مقتداؤں میں کوئی قطب الاقطاب ہے تو کوئی قطب وقت کوئی قطب زمین و زمان ہے تو کوئی قطب زمانہ کوئی غوث ہے تو کوئی غوث پاک، کوئی غوث الاعظم ہے تو کوئی غوث العالمین۔ مزید براں کسی کے نام کے ساتھ شیخ اکمل، کوئی شیخ طریقت اور کسی کا سابقہ شیخ المشائخ، کوئی شیخ الشیوخ، کوئی ابدال۔

راس الاولیا، زبدۃ الاصفیا، پیرانِ پیر، پیر دستگیر، پیر طریقت، سلطان العارفین، شیخ العرب والعجم، فخر السالکین، عمدۃ العارفین، رازئ زماں، غزالئ دوراں، امام الائمہ، شمس الائمہ، مجدد، مجددِ دوراں، مجدد ماۃ حاضرہ، مجدد الف ثانی، جامع المجددین، حکیم الامۃ،

امیر شریعت، اَئمّ علم اولیاء اور نہ جانے کیا کیا اس پر مستزاد ہے۔

اور اگر شیعہ چودہ معصومینؑ کا دامن پکڑ کر بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ دربارِ خداوندی میں طلب رحمت و مغفرت کریں تو مشرک ٹھہریں۔

شیعہ لٹریچر دنیا کی ہر زبان میں تقریباً بہ کثرت دستیاب ہے۔ ان کی کسی تحریر، کسی دستاویز، کسی علمی مقالہ، کسی مضمون یا ان کے کسی فقہی اجتہاد یا ان کے کسی رسالہ عملیہ میں آئمہ معصومین علیہم السلام کے لیے نہ قطب کا لفظ کا ملتا ہے، نہ غوث کا، نہ دستگیر کا، نہ پیر کا۔ وہ انہیں امامت اور پیشوائی اور حضورؐ کے علوم و معارف کے وارثین کا مقام دیتے ہیں اور اس کے آگے بڑھنے کے روادار نہیں ہیں۔ اس کے برعکس خواہ دیوبندی ہوں یا بریلوی، حنفی ہوں یا شافعی، القاب و خطابات کے نت نئے اختراعی الفاظ ان کے ہاں اس کثرت کے ساتھ ملتے ہیں کہ الفاظ کا بھرم جاتا رہا ہے۔

اے طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ

حتیٰ کہ انہوں نے دو دو کوڑیوں کے مولویوں کو خاتم الفقہاء والمحدثین، خاتم المفسرین، شیخ القرآن، شیخ التفسیر، امیر شریعت، خاتم الاولیاء والعارفین اور اسی قبیل کے بھاری بھرکم الفاظ سے یوں نوازا کہ "خاتم النبیین" کی معنویت ضائع ہو کر رہ گئی۔ اور امیر شریعت ایسا خطاب ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی کسی نے استعمال نہیں کیا تھا "تا بہ دیگراں چہ رسد"

بریلوی مسلک کے ایک بہت نیک دل عالم جو جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گئے میرے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ نام اس مرد شریف کا قاضی عبدالنبی کوکب تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شعبۂ مخطوطات کے نگراں تھے۔ جب میری پہلی کتاب "مولائے کائنات اور ان کے سیاسی حریف" شائع ہوئی تو وہ ایک دن سرِ راہے ملے اور میری تبدیلی مسلک پر انہوں نے افسوس کا اظہار کیا ضمناً انہوں نے

یہ بھی فرمایا کہ ہماری لائبریری کے انچارج شیعہ ہیں اور ان کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ نہایت غیر متعصب اور مرنجان مرنج شخص ہیں مگر ایک واقعہ نے ان کے بارے میں میری رائے بدل دی ہے۔''

قاضی عبدالنبی کوکب جن کی خاطر مجھے بہت عزیز تھی۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ فرمانے لگے:

''آج ایک صاحب جو غالباً شیعہ تھے ان لائبریرین سے ملنے آئے دونوں نے ایک دوسرے کو بجائے سلام کہنے کے ''یا علی مدد'' کہا۔

میں نے عرض کیا اس میں عصبیت کا کون سا پہلو ہے۔ یا علی مدد کہنا شیعوں کا شعار ہے اور شعار عصبیت کے مظاہرے کے لیے نہیں بلکہ ملّی تشخص کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو مولائے کائنات امیرالمومنین سیدنا علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے ذہنی اور قلبی وابستگی رکھتے ہیں وہ اظہارِ عقیدت و محبت کیلئے علی علیہ السلام کے نام کو سلامتی اور زندگی کی مشکلات میں سکون و راحت کی علامت سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے وقت اس نام کو دہراتے ہیں۔ قرآنِ مقدس نے سلام کیلئے کسی مخصوص لفظ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ تحیہّ کا جواب بہتر تحیہّ سے دو: واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا او ردوھا ''جب تمھیں کوئی شخص زندگی کی دعا دے تو تم بہتر لفظوں میں اسے زندگی کی دعا دو یا انہی لفظوں میں۔

تحیہّ کے لفظی معنی عربی لغت میں ''زندگی کی دعا دینا'' ہیں۔

سیدنا علی علیہ السلام کے اسم گرامی سے بڑھ کر زندگی کی دعا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک علیؑ کا نام لینے سے اس پوری جدوجہد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جو اللہ کے اس مخلص و فرماں بردار بندے اور پیغمبرؐ کے اس جاں نثار ساتھی نے ہر

آڑے وقت میں، ہر معرکہ حق و باطل میں، ایک محاذ جنگ پر اپنے حرب و حزب یداللّٰہی کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس ایک نام کے ساتھ تائید خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت، حضورؐ کی لختِ جگر سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی زندگی بھر کی رفاقت جوانانِ جنت کے سردار سیدنا امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے ان کی شفقتِ پدری، خود ان کی مظلومیت و بیچارگی اور میدانِ کربلا میں ان کی اولاد اطہار کی شہادت و بے بسی کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ پھر سیدنا علی کی عزیمت، ان کا صبر، ان کی استقامت، ان کی جرأت و ہمت، ان کی شجاعت و جوانمردی، ان کی قوت و توانائی، ان کا حوصلہ و ولولہ ان کی تب و تاب جاودانہ، ان کا علم و فضل، ان کی جلالتِ شان، ان کا فقر و استغنا غرضیکہ وہ تمام محاسن و کمالات، جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی انسان میں آج تک یکجا نہیں ہوئے۔ وہ تمام اوصاف و کمالات اس ایک نام کے اندر سمٹ آئے ہیں۔

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں ۔۔۔ نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

میں نے کہا قاضی صاحب! آپ تو مسلکاً بریلوی ہیں اور بریلویوں کے ہاں ختم غوثیہ یا ختم خواجگان میں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کا وظیفہ روز کا معمول ہے نیز گیارہویں کے موقع پر تو یہ شعر بڑے التزام سے پڑھا جاتا ہے ؎

امداد کُن، امداد کُن، از بندِ غم آزاد کُن ۔۔۔ در دین و دنیا شاد کُن یا شیخ عبدالقادرا

تو کیا سیدنا علی علیہ السلام کا مقام شیخ عبدالقادر[1] جیلانی سے بھی گیا گزرا ہے کہ شیخ کو مدد

---

[1] شیخ عبدالقادر جیلانی کے مریدانِ خاص میں ایک صاحب شیخ بن عدی بن مسافر اموی بھی تھے۔ ان صاحب نے یزید اور معاویہ کے فضائل کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گویا یوم یزید

کے لیے پکارنا تو جائز اور مستحن ہوا اور امیر المومنین علیہ السلام کا نام لینا عصبیت کا شرک قرار پایا۔ علیؑ کو مشکل کشا کہنا اور عبدالقادر جیلانی کو پیر دستگیر کہنے میں کیا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ شیعہ اگر علیؑ کو مشکل کشا کہہ کر پکاریں تو قابلِ اعتراض اور عبدالقادر جیلانی کو پیر دستگیر کہہ کر آپ بلائیں تو بجا اور درست! حالانکہ عبدالقادر جیلانی کو علیؑ سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک گدا کو ایک بادشاہ سے ہوتی ہے ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ محض شیعہ دشمنی کی بناء پر شیعوں کی ہر بات کو محل اعتراض قرار دینا کہاں کا انصاف ہے اور یہ کہاں کی شرافت ہے کہ اسی نوعیت کا جرم آپ کریں تو خوبی اور دوسرا کرے تو گردن زدنی۔

باقی رہا دیوبندیوں اور وہابیوں کا یہ کہنا کہ علیؑ کو مشکل کشا کہنے سے اور یا علیؑ مدد کا نعرہ لگانے سے شرک لازم آتا ہے تو اس ٹولے کو ساون کے اندھے کی طرح جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے ہر بات پر شرک کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جب تمہارا گزر کسی ایسی وادی میں ہو جہاں شیر کی موجودگی کا امکان ہو تو یہ دعا پڑھو شیر کے حملے سے محفوظ رہو گے۔"

اعوذ بدانیال وبالجب من شرّ ازسد

شیر کی برائی اور اس کے حملے سے میں پناہ چاہتا ہوں حضرت دانیالؑ کی

اور یومِ معاویہ کی جس رسمِ بد کو عطاء اللہ شاہ بخاری کے فرزندانِ خلف نے اختیار کیا اس کے بانی مبانی شیخ عبدالقادر جیلانی کے فیض یافتہ بزرگ تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عباسی دور کے وزیر اعظم ابن ہبیرہ دلیمی نے شیخ عبدالقادر جیلانی کی لاش ان کی قبر سے نکلوا کر جلائی اور اس کی راکھ دجلہ میں بہادی۔ (اعلام الزرکلی ج ۵۔ ص۱۱)

اور اس گڑھے کی جس میں وہ گرائے گئے تھے۔ (حیوٰۃ الحیوان دمیری)

اس حدیث پر علاّمہ انور شاہ کاشمیری نے جو دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین شیخ الحدیث تھے۔ اور جن کے بارے میں دیوبندی متفق الرّائے ہیں کہ علم و فضل و کمال میں ان جیسی شخصیت کہیں صدیوں میں پیدا ہوئی ہے کہ اپنی کتاب "خزینۃ الاسرار" میں لکھا ہے کہ :۔ اقول منه جواز الا ستغاثه بالصالحين (میری رائے میں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے نیک اور صالح بندوں کی پناہ طلب کرنا جائز ہے۔)

"یا علیؑ مدد"، کی نوعیت توسل کی ہے یا پھر استغاثہ بالصالحین کی اور علیؑ سے بڑھ کر صالح مومن کون ہو سکتا ہے بلکہ قرآنِ مقدس نے تو "صالح المومنین"، کے الفاظ انہی کیلئے استعمال کیے۔

راقم الحروف ابتدائی عمر میں جب "یوسف زلیخا"، جو ملاّ عبدالرحمٰن جامی کی شعری تصنیف ہے سبقاً سبقاً پڑھ رہا تھا تو ہمارے استاذ محترم مولانا خیر محمد جالندھری نے جو دیوبندیوں کے سرخیل تھے جامی کے اس نعتیہ شعر پر کہ ؎

زمہجوری برآمد جان عالم   ترحم یا نبی اللہ ترحم

جاؔمی کو مشرک قرار دینے کی بجائے اس کی توجیہہ یہ کی تھی کہ یہ ایک از خود رفتہ عاشقِ رسُول کی والہانہ محبّت کا اظہار ہے اس لیے جائز ہے۔

سیّدنا علی علیہ السّلام کے نام لیوا بھی ان کی گوناگوں صفات اور بے شمار محاسن کی بنا پر نیز پیغمبر خدا صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذات اقدس سے ان کی قرابتِ قریبہ کے اور حضورؐ کے لیے ان کی اور ان کے پورے خانوادے کی بے پناہ قربانیوں کے سبب والہانہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔

اگر جاؔمی "یارسول اللہ"، کہہ سکتے ہیں قاسم نانوتوی اپنے نعتیہ اشعار میں حضورؐ کو پکار سکتے ہیں تو محبانِ علیؑ اور مدعیانِ ولائے علیؑ کے لیے یا علیؑ مدد کہنا کیسے ناجائز ہوا۔

محبت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور نیتوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے محبتوں کو ناپنے کا کوئی پیمانہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔ ؎

قیس ہو، کوہ کن ہو، یا حالیؔ　　عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

۱۹۷۸ء میں جب راقم الحروف کو مدینہ منورہ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جنت البقیع میں سعودی حکمرانوں کے ہاتھوں قبروں کی بے حرمتی کا مشاہدہ کیا تو میں نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کا تذکرہ مشہور شیخ الحدیث مولانا ذکریا سہارنپوری سے کیا اس پر انہوں نے بھی اپنے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ مسجد قبا کے پہلو میں اس مکان کو بھی ڈھانے اور مسمار کر دینے کا پروگرام ہے جس میں حضورؐ نے ہجرت کے موقع پر قیام فرمایا تھا اور جسے سلاطین ترکی نے ایک قومی یادگار کے طور پر بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا تھا۔

شیخ الحدیث صاحب کی اس پریشانی کو دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ:

"مولانا! اصل مجرم سعودی حکمران نہیں ہیں بلکہ وہ بدباطن شخص تھا جس نے شجرہ بیعت رضوان کو جڑ سے اکھڑوا دیا تھا کہ لوگ آثارِ نبوت کے اس مقدس درخت کی زیارت کے لیے آتے تھے۔"

میرا اشارہ جن بدباطن شخص کی جانب تھا اس کا تصور کر کے شیخ الحدیث صاحب بگڑے اور نہایت غضب ناک ہو کر انہوں نے مجھے فی الفور مجلس سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ مجلس سے چلتے چلتے میں نے کہا:۔

"مولانا! مہاتما بدھ کو برگد کے جس مقدس درخت کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ وہ درخت تو ہندوستان میں "بدھ گیا" کے مقام پر محفوظ ہے اور حضورؐ نے جس درخت سے ٹیک لگا کر صحابہ سے بیعت لی تھی اور جس کا ذکر قرآنِ مقدس میں موجود ہے ۔ اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔"

آثارِ قدیمہ مہذب قوموں کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کے "بادشاہ سے

زیادہ وفادار قسم کے لوگوں نے اسلام کی تہذیبی اور ثقافتی حکمت عملی کو ملیامیٹ کر دیا۔

خلیفہ دوم جس تصوّرِ توحید کو فروغ دینے کی "سعیٔ بے خیر" میں مصروف رہے اس پر کسی مورّخ کو یہ پوچھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ توحید کا وہ تصور زیادہ معتبر ہے جو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس میں آثارِ قدیمہ کے تقدّس کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ ان کی عزت و حرمت میں دو چند اضافہ کر دیا گیا۔

مقامِ ابراہیمؑ کا تقدس، صفا و مروہ کی تعظیم و تکریم، حجرِ اسود کو بوسہ دینے اور یوں اس کی قدر و منزلت میں اضافہ حتیٰ کہ اس قربانی کے دنبے کے سینگ بھی محفوظ رکھے گئے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے عوض ذبح کیا گیا اور جو بعد میں خانہ، کعبہ پر حجاج بن یوسف ثقفی کی آتش بازیوں سے جل کر ضائع ہو گیا۔

یہ سب کیا شرک تھا جبکہ قرآنِ مقدس نے انہیں شعائر اللہ میں شمار کیا اور شعائر اللہ کی تعظیم کو تقوے کی علامت قرار دیا۔ توحید کا وہ تجریدی تصور جو ان نام نہاد مدعیانِ مشیخت کی دماغی یبوست و عبوست کی پیداوار ہے کیونکر معتبر تسلیم کیا جائے کہ توحید کی نزاکتوں کا جتنا احساس حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہو سکتا تھا اور کس کو ہو سکتا تھا۔ تم کیا اور تمھاری اوقات کیا کہ تم ہر مرحلے میں حضورؐ سے کبھی دو چار ہاتھ آگے رہنے کی کوشش کر رہے ہو تاکہ دنیا کو اپنی اسلام سے وفاداری کا تاثر دے سکو۔

"ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلائے" کی کہاوت اسی بیمار ذہنیت کے افراد کی عکاسی کرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کا دامن حضرت عمر اور ان کے پیروکاروں کے ہاتھوں تار تار ہے کہ ان حضرت نے "عمر عیار ہے سو بھیس بدل لیتا ہے" کے مقولے کو اپنی اسلام دشمنی کے مختلف حربوں اور حیلوں سے سچ کر دکھایا۔

اور وہ لوگ جو "کاتا اور لے دوڑی" طرز کے مسلمان ہیں اور جن کا کل اثاثہ سُنی سنائی باتیں ہیں اور اس بنا پر سُنی کہلاتے ہیں وہ اسلام دشمنی نے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر

واہ واہ سبحان اللہ اور "ہاتھ لا استاد کیوں کیسی رہی" کی تحسین آفریں میں لگ جاتے ہیں۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شیعوں کے خلاف چھوٹے الزامات میں سرفہرست ایک الزام یہ بھی ہے کہ شیعہ قرآنِ مقدس کی صحت پر یقین نہیں رکھتے اور وہ قرآن کے تیس کی بجائے چالیس پارے مانتے ہیں اور قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

اہلِ سنّت کی فریب کاری اور جھوٹ کی سیاست جس کی بنیاد ان کے پیشوا معاویہ بن ابی سفیان نے رکھی تھی۔ اس کے عین مطابق ان حضرات کا یہ معمول رہا ہے کہ جس جرم کے وہ خود مرتکب ہوں اس کا الزام دوسروں پر عائد کر کے اپنے جرم کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بالکل اس چور کا سا طرزِ عمل ہے جو چور چور کے شور میں خود بھی چور چور کی ہانک لگا کر خود کو صاف بچا کر نکل گیا تھا۔

اہلِ سنّت کے تمام محدثین نے اپنی کتب صحاح میں ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن سے قرآن کی صحت و صداقت مشتبہ قرار پائے۔ مثلاً بخاری کی یہ روایت کہ "معوذتین" (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) عبداللہ بن مسعود کے نزدیک قرآن کا حصہ نہیں ہیں یا آیت رجم کی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے مگر اس کا حکم باقی ہے اور صحاح ستہ ہی کی روایت کے مطابق یہ آیت نازل ضرور ہوئی تھی مگر حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ان کی بکری اس پتے کو کھا گئی جس پر یہ آیت درج تھی اس لیے تمام اہلسنّت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت منسوخ التلاوۃ ہے مگر منسوخ الحکم نہیں ہے۔

کیا آپ نے دنیا کے کسی آئین و دستور میں یہ بوالعجبی ملاحظہ کی ہے کہ اس کے دفعات کی ایک شق حذف کر دی گئی ہو۔ اس کی کتاب قانون میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی موجود نہ ہو مگر اس پر عمل درآمد کو لازم قرار دیا گیا ہو مگر علمائے اہلِ سنّت کے ہاں یہ بوالعجبی اسلام کی کتاب ہدایت میں موجود ہے کہ آیت کی تلاوت بھی منسوخ ہے اس

کی کتابت بھی ممنوع ہے اور اس کا اجرا (IMPLEMENTATION) قائم ودائم ہے۔ اس کھلی دھاندلی اور صریحاً بد دیانتی کا مقصد قرآن کی صحت کو مشکوک کرانے کے سوا کیا ہے۔

یہ روایت بھی اہلِ سنت کی صحاح ستہ میں بڑی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اور صرف اہلِ سنت ہی کے محدثین و رواۃ کو اس روایت کا شرف حاصل ہے۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کہ

نماز میں دورانِ تلاوت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ والنجم (پ۲۷) میں اپنی طرف سے حسبِ ذیل الفاظ بڑھا دیئے جن سے کفار مکہ کی بت پرستی کا جواز ثابت ہوتا تھا اور یہ الفاظ اہلِ سنت کی تمام کتب حدیث میں مندرج ہیں:

تلک الغرانیق العلی منهن الشفاعة ترتجی

(یہ بت بڑی عظیم ہستیاں جن سے امید شفاعت کی جاتی ہے) العیاذ باللہ

قرآن مقدس میں اعراب کی تبدیلی کا اندازہ سورۂ یوسفؑ کی اس آیت سے ہو سکتا ہے۔

ثم یاتی من بعد ذٰلک عام فیه یغاث الناس وفیه یعصرون۔ (سورہ یوسف پ)

پھر اس کے بعد ایسا برس آئے گا جس میں لوگ سیراب کئے جائیں گے اور جس میں وہ شراب کشید کریں گے۔

اب ایک شخص نے یہ آیت امیرالمومنین سیدنا علی علیہ السلام کے سامنے اسی اعراب کے ساتھ تلاوت کی تو جناب امیر علیہ السلام نے اسے ٹوکا اور فرمایا "افسوس ہے تجھ پر! کیا وہ شراب کشید کریں گے؟

اس شخص نے عرض کیا "امیرالمومنینؑ! پھر میں اسے کس طرح پڑھوں؟ ارشاد فرمایا اس لفظ "یعصرون" کو معروف کی بجائے بصیغہ مجہول پڑھو جس کے معنی "بادلوں سے بکثرت پانی کے گرنے کے ہیں اور اس کی دلیل خود قرآن مقدس ہے جس نے برسنے

والے بادلوں کے لیے "معصرات" کا لفظ استعمال کیا ہے:

وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجاً (سورہ نباء پ۳۰)

ہم نے بادلوں سے موسلا دھار بارش برسائی (پ ۳۰)

اعراب قرآن میں یہ تبدیلی اور تحریف کیوں روبہ عمل آئی محض خلفاء کیلئے سند جواز پیدا کرنے کی خاطر۔ ان شراب خور خلفاء میں سر فہرست نام حضرت عمر ابن خطاب کا ہے جس کی تفصیل آپ کتاب میں پڑھیں گے۔ سو شیعہ حضرات کو قرآن میں تحریف کی کیا ضرورت تھی کہ ان کا اور ان کے تمام ائمہ معصومین علیہم السلام کا متفقہ اور مسلمہ فیصلہ ہے کہ:

حلال محمد حلال الیٰ یوم القیامه و حرام محمد حرام الیٰ یوم القیامة

محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حلال کی ہوئی چیزیں قیامت تک کے لیے حلال ہیں اور حضورؐ کی حرام کی ہوئی چیزیں تاابد حرام ہیں۔

قرآن پاک میں تحریف کی جرأت وہی شخص کر سکتا ہے جو شریعت میں تحریف کر سکتا ہو اور یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے خلافتِ راشدہ کے دور میں ہوتا رہا ہے۔ میں جب اس قسم کے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ رسول اللہ کے کسی فیصلہ کو ان کے کسی نام نہاد جانشین نے منسوخ کر دیا یا حضورؐ کے کسی حکم کو بدل دیا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ شارع حضورؐ کی ذات ہے یا فلاں خلیفہ کی؟ حدیث و تفسیر کی تمام معتبر کتابوں میں عمر ابن خطاب کے فضائل کے باب میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں جن آٹھ طبقوں کو مستحقین کے زمرہ میں شامل کیا ہے حضرت عمر نے ان میں سے ایک طبقہ کو مستحقین کی فہرست سے خارج کر دیا۔ یہ "مولفۃ القلوب" کا وہ گروہ تھا جو نیا نیا اسلام کا حلقہ بگوش ہوا ہو۔ حضرت عمر نے اپنے اجتہاد و قیاس سے کام لیکر نومسلموں کے اس حق کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اب جبکہ اسلام ایک طاقت ور تحریک بن چکا ہے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے رہیں۔

اگر قرآن پاک کلام خداوندی ہے اور عمر ابن خطاب بھی اسے ایسا ہی سمجھتے تھے تو کیا وہ اپنی حدود کار سے واقف نہیں تھے اور کیا انہیں اتنا شعور بھی نہیں تھا کہ کلام الٰہی کے حکم یا قانون کو تبدیل کرنے کا پیغمبر بھی مجاز نہیں ہے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ قرآن کے تمام قوانین دائمی اور ابدی ہیں۔ اور قوموں کے عروج و زوال یا ضعف و کمال سے انہیں بدلا جاسکتا ہے۔ کیا وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر سے بھی زیادہ فطرت انسانی کے محرم تھے اور آخر ان کی حیثیت کیا ہے۔ کیا وہ شارع تھے۔ کیا انہیں دستور سازی کا اختیار تھا۔

آج کل جماعت اسلامی والے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے علمائے اہلسنت صبح و شام یہ کہتے نہیں تھکتے کہ قرآن کے کسی حکم میں ردوبدل نہیں کیا جاسکتا، وہ اٹل اور محکم وحی ہے۔ ان کے عقائد کی کتابوں میں بھی یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ لیکن عمر ابن خطاب کا حوصلہ دیکھئے کہ وہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جسے چاہیں حرام ٹھہرادیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اور اس پر الزام ہے تو شیعوں پر کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

تحریف صرف الفاظ میں تبدیلی کا نام نہیں ہے۔ معانی میں گڑبڑ کرنا اور کسی حکم کو معطل کر دینا بھی تحریف کی بدترین صورت ہے۔ احکامِ قرآنی میں حضرت عمر کی جانب سے تحریف کی یہ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ انہوں نے ایسی بہت سی حرکتیں بھی کیں جن سے فرامینِ خدا و رسول کی نفی ہوتی تھی ان میں سے ایک مسئلہ "متعہ" کا بھی ہے جسے اہلِ سنّت نے بغیر سوچے سمجھے اور بلاوجہ اپنی خباثتِ نفس کا ایک نشانہ بنالیا ہے۔ حالانکہ ایک پاکیزہ اور بااخلاق معاشرہ میں مطلقہ یا بیوہ عورتوں اور شادی کی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآنہ ہونے والے افراد کے جنسی تقاضوں کی تکمیل کی یہ ایک بہت عمدہ متبادل صورت

تھی۔ قرآنِ مقدّس نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد ہمایوں میں اس کی عام اجازت تھی لیکن حضرت عمر نے اس کی مخالفت کا نادرشاہی فرمان جاری کر دیا۔

فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں وضاحت کی ہے کہ آغاز اسلام میں اس کے جواز پر سب متفق ہیں۔ البتہ بعض روایت میں ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر جواز متعہ کا حکم منسوخ ٹھہرا لیکن وہ کون سی آیت میں ہے اس کا ذکر یار لوگ گول کر گئے۔ بلیشتر روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر اور حجۃ الوداع کے زمانے میں حضورؐ نے متعہ کی اباحت کا ذکر فرمایا اور اس کی اباحت برقرار رکھی اب یہ کیونکر ممکن ہے کہ منسوخ کرنے والا حکم پہلے آئے اور اس کی مشروعیت کا اعلان بعد میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اس خالصتہً دینی مسئلہ پر بھی خلیفۂ دوم نے بلا جواز ٹانگ اڑائی اور منبر پر چڑھ کر اعلان کیا کہ متعہ کی اجازت واپس لی جاتی ہے۔

ذرا اس ساختہ جانشین پیغمبر کے تیور ملاحظہ ہوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی اس پر وحی آسمانی کا نزول ہوتا رہا ہے۔ ذرا دستی ایں کوتہ آستیناں ہیں۔

متعتان کانتا مشروعتین فی عہد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) وانا انہی عنہما متعۃ الحج ومتعۃ النکاح۔"

"حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں دو متعہ جائز تھے۔ متعۂ حج اور متعۂ نکاح اور اب میں ان دونوں کی ممانعت کا حکم صادر کر رہا ہوں۔"

کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ آپ کون ہوتے ہیں۔ قرآن کے ایک حکم کو منسوخ کرنے والے اور آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ پیغمبر علیہ وآلہ السلام کے فیصلہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیں ——— ایاز قدر خود بشناس ———

دوسروں کا حق غصب کر کے اور زور زبردستی سے مسند خلافت پر قبضہ جما لینے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ کو پیغمبری کے اختیارات مل گئے ہیں کہ آپ احکامِ شریعت میں

دخل در معقولات کرنے لگے۔ بندہ پرور مگر خدا شدہ ای۔ ! مشہور صحابی حضرت عمران بن حصین نے خوب حضرت عمر کی اس "دخل در معقولات" کی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

ان الله انزل فی المتعه اية ومانسخها باية اخری و امرنا رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم بالمتعة ومانهانا عنها ثم قال رجل برایه ماشاء

اللہ تعالیٰ نے متعہ کے جواز کے بارے میں ایک آیت نازل کی اور کسی دوسری آیت کے ذریعے اسے منسوخ نہیں فرمایا حضورؐ نے بھی ہمیں اس کی اجازت دی اور کبھی اس سے منع نہیں فرمایا۔ پھر ایک شخص اٹھا اور اپنی رائے سے اس میں تبدیلی کر دی۔

شرح معانی الآثار میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

ما کانت المتعة الا رحمة رحم الله بها هذه الامة ولولا نهی عمر بن الخطاب لما زنی الا شقی۔

متعہ کے جواز کا حکم ایک خصوصی نوازش تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو نوازا تھا اور اگر عمر ابن الخطاب نے اس کی ممانعت نہ کر دی ہوتی تو سوائے کسی انتہائی بدبخت شخص کے کوئی بھی زنا کے جرم کا مرتکب نہ ہوتا۔

قرآنِ مقدس کے پانچویں پارے کی پہلی آیت سے متعہ کا اثبات ہوتا ہے۔ علمائے امت کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ قرآن کی آیت کو صرف قرآن ہی کی کوئی آیت منسوخ کر سکتی ہے۔ حدیث سے قرآن کے کسی حکم پر خط نسخ نہیں کھینچا جا سکتا۔ خود قرآن نے بھی جہاں نسخ آیات کا ذکر کیا ہے وہاں تصریح کی ہے۔

ما ننسخ من آیة او ننسها نات بخیر منها او مثلها

ہم جب کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا اسے حافظہ سے محو کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی کوئی دوسری آیت اس کے بدلے میں لے آتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیت قرآنی کو آیتِ قرآنی ہی منسوخ کر سکتی ہے لیکن یہاں "خلیفۂ راشد" قرآن کے احکام پر ہاتھ صاف کر رہا ہے اور الٹا تحریف کا الزام شیعوں پر لگایا جاتا ہے جو اپنے آئمہ معصومین کو بھی جن کا مرتبہ و مقام حضرت عمر سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے یہ حق نہیں دیتے کہ وہ کسی حکم خداوندی کو اپنی رائے اور مرضی سے منسوخ کر دیں۔

ایک سُنّی عالمِ دین نے مجھ سے فرمایا: "متعہ کے جواز سے مسلمانوں کے معاشرہ میں جنسی انارکی پھیلتی ہے" اس نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قرآنِ مقدس کی اس آیت سے استناد کیا: والذین ہم لفروجہم حافظون الا علی ازواجہم اوماملکت ایمانہم (اہلِ ایمان وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں اور ان عورتوں کے جنھیں انھوں نے مال کے عوض حاصل کیا ہو۔)

ان کے استدلال کا مدعا یہ تھا کہ اس آیت میں صرف بیویوں اور لونڈیوں سے جنسی روابط رکھنے کی اجازت ہے، اس کے علاوہ اگر کسی جگہ جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت ہوتی تو اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

میں نے ان سے کہا: کیا لونڈیوں کی خرید و فروخت اور ان سے جنسی روابط قائم کرنے سے جنسی انارکی نہیں پھیلے گی اور پھر "ماملکت ایمانہم" سے آپ صرف لونڈیاں ہی کیوں مراد لیں، ممتوعہ عورت بھی تو اس زمرہ میں شامل ہے اور بالفرض اس سے مراد صرف لونڈیاں اور باندیاں ہیں تو جو قباحت آپ کو متعہ میں نظر آتی ہے لونڈیوں کے کاروبار میں تو بدرجہ اولیٰ یہ قباحت موجود ہے۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے پھر کچھ سوچ کر فرمانے لگے۔ "میں لونڈیوں کے مسئلے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔

میں نے کہا تو صاف صاف کہیئے کہ آپ کو شریعت اسلام اور احکامِ خداوندی کے بارے میں بے اطمینانی ہے اور اس بے اطمینانی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آپ ان حکمتوں اور

مصلحتوں سے بیخبر ہیں جو اسلام نے جنسی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے اختیار کی ہیں۔

شبلی نعمانی نے الفاروق میں اوّلیات عمر کی پوری ایک فہرست گنوائی ہے اور اس فہرست میں ان کے وہ کارنامے درج کئے ہیں جن کا عہد رسالت میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جہاں تک ملکی نظم ونسق اور سیاسی تدابیر کا تعلق ہے حکمران کو از خود فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہے لیکن شریعت کے احکام میں ردّوبدل کرنا یا خدا رسول کے واضح ارشادات کے مقابلہ میں اپنے قیاس و اجتہاد کو فوقیت دینا ایک ایسی ناروا جسارت ہے جس کی گنجائش اسلامی تعلیمات کی رو سے ہرگز نہیں ہے۔ نہ ابوبکر و عمر کے لیے نہ عثمان کے لیے۔ نہ امام الائمہ سیدنا علی علیہ السلام کیلئے۔

لیکن اہلِ سنّت کے ہاں دین کی تمام تر بنیاد ہی قیاس آرائی پر مبنی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بیسیوں امام ہیں اور ان کی بھانت بھانت کی بولیاں ہیں۔ ایک کے نزدیک ایک شے حلال ہے، دوسرے کے نزدیک وہی شے حرام ہے۔ ایک امام ایک چیز کو جائز قرار دیتا ہے، دوسرا اسے ناجائز، تیسرا مکروہ۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ جب خلیج فارس کے مشہور جزیرے مسقط پہنچا تو وہاں اس نے جگہ جگہ کتّوں کا گوشت ٹنگا دیکھا۔ اسے سخت تعجب ہوا اور جب اسے بتایا گیا کہ اس بستی کی بیش تر آبادی امام مالک کے مقلّدین کی ہے اور مالک کے نزدیک کُتّے کا گوشت حلال ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی۔

گویا سنیوں کے ایک امام اور اس کے پیروکاروں کے نزیک کُتّے کا گوشت بھی ماکولات میں شامل ہے ——— بریں مژدہ گرجاں فشاں نم رواست ———

جلال الدین سیوطی نے جو مشہور محدّث، مفسر اور نویں صدی ہجری کا امام و مجدّد مانا جاتا ہے اس نے امام مالک کے ایک رسالہ کی تلخیص کی ہے اور لواطت و اغلام بازی کو امام مالک کے نزیک مجرّد شخص کے لیے جائز قرار دیا ہے اور بہ ایں وضاحت کہ کسی امر و یعنی

بے ریش اور نوخیز لڑکے کے ساتھ یہ فعل بد مباح ہے۔ گویا اس شرمناک فعل کو جس کی بنا پر قرآن مقدس کی رو سے ایک پوری قوم کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ ایک امام اہلسنّت نے صرف روا رکھا بلکہ وہ بھی نوخیز و نوعمر لڑکے کے ساتھ۔ سیوطی نے اس کے استشہاد میں یہ شعر بھی نقل کیا ہے ؎

وجوز واوطی غلام امرد

لاسیما للرجل المجرد

بے ریش اور نوخیز لڑکے سے مباشرت کو جائز قرار دیا ہے اس شخص کے لیے جو مرد مجرّد ہو یعنی بیوی پاس نہ ہو۔

اب اس قسم کے قیاسات و اجتہادات کی بات چل نکلی ہے تو مشتے نمونہ از خروارے چند دیگر اجتہادات ملاحظہ فرمائیں۔ اقبالؔ نے کہا تھا ؎

زاجتہاد عالماں کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

امام ابو حنیفہ (امام اعظم) کے نزدیک چھبیس ۲۶ قسم کی شراب جائز ہے۔

امام اعظم کے نزدیک شراب سے بھی وضو جائز ہے اور دودھ کی لسّی سے بھی جب کہ اہلسنّت کے دوسرے تین امام اس کے خلاف ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک اجنبی اور نامحرم عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حنفیوں کے نزدیک نہیں ٹوٹتا۔ مالکیہ کے نزدیک اگر اجنبی عورت کے لمس میں شہوت کی آمیزش ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔

شافعی کے نزدیک زنا کے نتیجہ میں اگر حمل قرار پائے اور لڑکی پیدا ہو تو باپ اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے۔ باقی تین امام اس کے مخالف ہیں۔

حنفیوں کے نزدیک بدن سے تھوڑی مقدار میں خون نکلنے پر بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے دوسروں کے نزدیک نہیں ٹوٹتا۔ انگلی پر نجاست لگی ہو اور اسے چاٹ لیا جائے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک انگلی پاک ہو گئی۔

شافعی کے نزدیک لومڑی اور بجو وغیرہ کا گوشت حلال ہے۔ باقی امام اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ گویا شریعت نہ ہوئی بازیچۂ اطفال ہوا کہ اگر عمر ابن خطاب چاہیں تو وہ اس میں اپنی مرضی سے ردوبدل کر دیں اور اگر ابو حنیفہ اور ان کے چھٹ بھیئے اٹھیں تو وہ اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑا کر حلال و حرام کے فیصلے صادر کرتے پھریں۔

قرآنِ مقدس نے بہت پہلے سے تنبیہ کر دی تھی کہ حلّت و حرمت اشیاء پر رائے زنی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے بجز خدا اور رسول کے :۔

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون۔

"اور تم جھوٹ بول کر یہ مت کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے یوں اللہ پر بہتان باندھتے پھرو، جو لوگ خدا پر بہتان باندھ کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔

شیعی عقائد و اعمال پر تنقید اہلِ سنّت کے کم سواد علماء کا معمول ہے اور یہ تنقید محض جہالت و تعصب پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں نہ کسی علمی استدلال سے کام لیا جاتا ہے، نہ معقولیت سے، محض جھوٹا پروپیگنڈا ان کا مقصد ہوتا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنے جاہل عوام کو شیعیت سے متنفر کرتے اور مسلک تشیع کو زک پہونچانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ ان مسائل میں جو سُنّی مولویوں کی مناظرانہ افتادِ طبع انصیاطی نشانہ بنتے ہیں ایک مسئلہ "بدا" کا ہے جس کے بارے میں سُنّی علماء کہتے ہیں کہ "بدا" کا مفہوم یہ ہے کہ جہل و بے خبری کی نسبت خدا کی جانب کی جائے۔ لیکن سُنّی علماء جس طرح قرآن پاک میں تحریف کا مشغلہ اپنائے ہوئے ہیں جس طرح انہوں نے فقہ اور احکام شریعت کو اپنے خود ساختہ خلیفوں اور اماموں کے ذریعے بدلنے سے گریز نہیں کی وہاں اسی فطرتِ بد کی بدی کی بدولت وہ شیعی عقائد و اعمال پر زباں طبع درازنہ کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ یہ گویا ان کے فرائض منصبی کا حصہ ہے۔

"بدا" کا مفہوم بہت سیدھا سادہ اور غیر مبہم ہے اور شیعہ عقائد کی مستند کتابوں میں اس کی جو تشریح ملتی ہے اس کے بموجب"
احکامِ الٰہی میں بدا کی وہی حیثیت ہے جو آیاتِ قرآنی میں نسخ کی ہے۔ اگر آیات منسوخ ہونے سے خدا پر جہل کا الزام عائد نہیں ہوتا تو کسی حکمِ شریعت کو واپس لینے سے اس پر جہل کا الزام کیسے لگ سکتا ہے۔ مگر ایک جھوٹا پروپیگنڈا ہے جو مسلسل کیا جا رہا ہے اور خدا و رسول کے نام پر لگاتار جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کبرت کلمة تخرج من افواههم ان یقولون الا کذبا۔
(اسی قسم کا معاملہ "تقیہ" کا ہے کہ علمائے سوء کی زہر آلود زبانیں تقیہ کو ہدف تنقید و ملامت بنائے ہوئے ہیں اور اسے نفاق کے ہم معنی قرار دے کر شیعہ حضرات پر منافق کی پھبتی کسی جاتی ہے حالانکہ تقیہ کا مفہوم وہی ہے جو اہلسنّت کے نزدیک "توریہ" کا ہے یعنی مصلحت وقت کی بناء پر یا کسی اندیشہ نقصان کے سبب یا خوف و خطر کے باعث یا دفع ضرر کے لیے بات اس ڈھنگ سے کی جائے کہ مخالف کی ایذا رسانی سے بچا جا سکے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ "لم یکذب ابراهیم الا ثلاث کذبات ابراہیم علیہ السلام نے زندگی میں صرف تین جھوٹ بولے۔ تعجب ہے کہ بخاری اگر حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کی جانب جھوٹ بولنے کی نسبت کرے تو اسے تو یہ کہہ کر سندِ قبول بخشی جائے کہ یہ "توریہ" تھا۔ اور شیعیان علیؑ میں سے کوئی شخص اگر معاویہ اور اس کی معنوی اولاد کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے تقیہ کرے تو گردن زدنی۔
قرآن اور حدیث دونوں سے تقیہ کے لفظ و معنی کا سراغ ملتا ہے۔ "الا ان تتقو منهم تقاة (مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ کی کوئی صورت کر رہے ہو) کی قرآنی آیت اور "شر الناس من یکرم اتقاء شره" (بدترین شخص وہ ہے کہ اس کے شر سے بچنے کے لیے لوگ اس کی عزت کریں) کی حدیث نبوی دونوں سے تقیہ کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔
قرآن مقدس نے تو جبر و تشدد کی صورت میں کلمۂ کفر کہنے کی بھی اجازت دی ہے۔ "الا من اکره وقلبه مطمئن بالایمان" جن کا دل جذبۂ ایمانی سے سرشار ہوا نہیں

کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو ان کا یہ مارے باندھے کا جرم قابلِ معافی ہے۔ جو لوگ تقیہ کو منافقت سے تعبیر کرتے ہیں ان کے نزدیک "توریہ" کا مفہوم کیا ہے۔ جن لوگوں کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہو کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" (فتنہ پیدا کرنے والی سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے) وہ تقیہ کے معاملے میں شیعوں کو برا بھلا کہیں تو ان عقل کے اندھوں سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اور پھر جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ خدا بھی جھوٹ بول سکتا ہے انہیں کسی انسان کے تقیہ کرنے پر اعتراض کیوں ہو۔

تقیہ ایک ایسا عمل ہے جس کا صدور ہر شخص سے ہوا ہے اور ہوتا ہے اور یہ ہے کہ ہر شخص دوسروں کے گریبانوں میں جھانکنے کی بجائے خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے۔

قرآنِ مقدس نے "مومن آل فرعون" کا ذکر کیا ہے اور اس صفت کے ساتھ

(وہ اپنے ایمان کو فرعون سے چھپائے ہوئے تھا)

کیا ان کی کیفیت کو دفع ضرر کے لیے اہلِ باطل سے پوشیدہ رکھنا تقیہ نہیں ہے؟ پھر جس بات کی توثیق قرآن کر رہا ہو آپ کو اس پر ناک بھوں چڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔

جب تک شیعیت کا قریب سے مطالعہ نہیں کیا تھا شیعہ مسلک کی ہر بات انوکھی اور نرالی لگتی تھی حتیٰ کہ شیعوں کی نماز بھی عجیب محسوس ہوتی تھی مگر اب جبکہ حقائق زیادہ واضح شکل میں نظر آ رہے ہیں تو محسوس ہوا کہ شیعوں کے ہاں جو نماز رائج ہے اس سے بہتر اور جامع نماز کا تصور ممکن ہی نہیں، یہی اصل نماز ہے اور سنتِ نبوی کے عین مطابق بھی۔

اہلِ سنت کے تین اماموں مالک، شافعی، احمد بن حنبل کے ہاں رفع یدین حدیث سے ثابت ہے اور وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ فقہ جعفریہ کی رو سے بھی ہر تکبیر کے وقت رفع یدین یعنی دونوں ہاتھوں کو بلند کرنا مسنون ہے۔ امام اہلسنت مالک بن انس کے

نزیک ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ امام مالک کی فقہ کو "فقہ مدینہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جس پر اہلِ مدینہ عامل تھے۔ فقہ جعفریہ میں بھی "ارسال یدین" یعنی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔

البتہ فقہ جعفریہ کی نماز کو جو چیز اہلِ سنت کی نمازوں سے ممتاز و ممیز کرتی ہے وہ محمدؐ و آلِ محمدؐ پر نماز میں صلوٰۃ وسلام کی کثرت ہے کہ ان کے ہاں رکوع وسجود میں تسبیح و تحمید کے بعد ہر تشہد میں اور ہر دعا کے بعد

کہنا ضروریات نماز میں سے ہے اور اس طرح نمازی جہاں خدا کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرتا ہے وہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل اطہار کی ذوات مقدسہ بھی اس کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ اور یہی وہ شرف و امتیاز ہے جو ایک شیعہ نمازی کو دوسرے فرقوں کے نمازیوں پر حاصل ہے۔ وہ اپنی سب سے افضل عبارت کو بھی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے توسل سے خدا کے حضور میں پیش کرتا ہے ؎

گو حرم کے راستے سے بھی پہونچ گئے خدا تک   تری گزر سے جاتے تو کچھ اور بات ہوتی

کی جو کیفیت اس نماز میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور کو کہاں نصیب، یہ کیفیت اس امر کی غماز ہے کہ نماز پڑھنے والے کو جہاں اپنے پروردگار سے عجز و نیاز کا تعلق ہے وہاں نماز کا حکم دینے والے پیغمبرؐ اور اس کی آل اطہار کو بھی اس نے اپنی نیازمندیوں میں فراموش نہیں کیا۔

یہ سپاس گزاری و تشکر اور احسان شناسی کا قابل قدر مظاہرہ ہے جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ مجھے یہاں دیوبندی مکتب فکر کے اس بدنہاد ملّا کی وہ عبارت اس مرحلے پر یاد آ رہی ہے جس نے اپنے خبثِ باطنی کا بدترین مظاہرہ کرتے ہوئے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ: "اگر نماز کے دوران گدھے کا خیال آجائے تو نماز نہیں ٹوٹتی لیکن اگر نماز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال آجائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔"

بلکہ مولوی الیاس کی بستر بند پارٹی (تبلیغی جماعت) کے لوگ تو یہاں تک کہنے لگ گئے

ہیں کہ صرف نماز ہی فاسد نہیں ہوتی وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔،،

اس قسم کے بدنہاد ملاؤں سے اور ان کے دُونِ فطرت معتقدوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت سے دل بستگی کا اظہار کریں گے ایک سودائے خام ہے۔ ان کو تو صحابہ بھی اسی لیے عزیز ہیں کہ انھوں نے پیغمبرؐ اور ان کی آلؑ سے بغض و عناد رکھا۔

اہلِ سنّت کے نزدیک سب سے افضل درود نماز میں پڑھا جانے والا درود ابراہیمی" ہے اور اس میں محمدؐ و آلؑ محمدؐ علیہم السلام دونوں پر صلوٰۃ وسلام بھیجا گیا ہے لیکن حضورؐ کے نام نامی و اسم گرامی کے ساتھ یہ لوگ تحریری طور پر یا زبانی صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ ان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے "وآلہ کے لفظ کو چودہ سو برس سے متروک قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ "صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" کہنا موزوں بھی ہے اور درودِ ابراہیمی کے مطابق بھی بجز شیعیان علیؑ کے اس دھرتی پر اور کوئی گروہ نہیں جو محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام دونوں پر صلوٰۃ وسلام کا التزام کرتا ہو انہی کے مقدّر کا طرۂ امتیاز ہے۔

عبداللہ بن زبیر کے متعلق تاریخ وسیر کی کتابوں میں یہ شرمناک واقعہ مذکور ہے کہ اس نے اپنے چند روزہ دورِ اقتدار میں حضور نبی اکرمؐ پر صلوٰۃ وسلام کا سلسلہ روک دیا تھا اور اس کی صفائی میں یہ دور کی کوڑی لایا تھا کہ :۔ لا یمنعنی من ذکرہ الا ان تشمخ رجال بانا فہا۔ (ابن ا کلبی واقدی) (مجھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام سے صرف یہ چیز روکتی ہے کہ اس سے کچھ لوگوں کی ناک اونچی ہو جاتی ہے۔") اس کا اشارہ بنو ہاشم کی جانب تھا۔

اس قسم کے احسان فراموش اور ناسپاس لوگ اہلسنّت کے حضرات ہیں اور بڑے حضرت ہوں یا چھوٹے سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ بڑے میاں سو بڑے میاں

چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ مجھے یقین ہے کہ پیشہ ور مولویوں کو چھوڑ کر اہلِ سنّت کے عوام کو اگر یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ ان کے ان حضرتوں نے حضورؐ کے بارے میں کس قدر سرد مہری، بے مروتی اور احسان ناشناسی کا ثبوت دیا ہے تو وہ عقیدت کے ان خود تراشیدہ بتوں کو خود اپنے ہاتھوں توڑ ڈالنے میں ذرا بھی تامل نہیں کریں گے۔ کیا یہ ایک حیران کن بات نہیں ہے کہ اہلِ سنّت صدیوں سے اپنی نمازوں میں درودِ ابراہیمی پڑھ رہے ہیں اور اہلسنّت کے ایک امام شافعی کے نزدیک نماز پر تشہد کے بعد درود پڑھنا واجبات میں سے ہے لیکن اس کے باوجود کبھی ان کا ذہن اس جانب منتقل نہیں ہوتا کہ درودِ ابراہیمی میں جب ہم خدا سے یہ استدعا کرتے ہیں کہ: "اے خدا محمدؐ آلِ محمدؐ پر اسی طرح رحمت و برکت نازل فرما جیسی رحمت و برکت سے تو نے ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ کو نوازا" و آلِ ابراہیم کے بارے میں قرآن شہادت دیتا ہے کہ

قد آتینا آل ابرهیم الکتاب والحکمۃ و آتینهم ملکا عظیماً۔

(ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت عطا کی اور ہم نے انہیں بہت بڑی سلطنت سے نوازا اور سرفراز کیا۔)

نمازوں میں درودِ ابراہیمی پڑھنے کے باوجود آلِ محمدؐ کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیا رہا کہ ہم نے آلِ محمدؐ کی امامت و پیشوائی کو تسلیم کیا نہ انہیں حکمرانی کے قریب پھٹکنے دیا نہ انھیں وہ عزت و تکریم دی جس کے وہ مستحق تھے۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو صنم پکاریں ہری ہری

ہم نے جولاہوں، موچیوں، تیلیوں، حلوائیوں اور مجہول النسب لوگوں کو تو اپنا امام قرار دیا لیکن آلِ محمدؐ کے ائمہؑ کے نام تک نہیں معلوم ہیں۔ ہم نے دشمنان آلِ محمدؐ کی حکمرانی کو تو خلافتِ راشدہ سے تعبیر کیا، آلِ محمدؐ کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا حتیٰ کہ ہم نے حضورؐ کے بارہ جانشینوں میں معاویہ، یزید، مروان اور اس

کے بیٹوں تک کو شامل کیا (حوالہ کے لیے دیکھئے ملا علی قاری کی شرح فقہ اکبر) لیکن آلِ محمدؐ علیہم السلام کو دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی منصب و مقام نہیں ہے لیکن درودِ ابراہیمی پڑھنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ قول و فعل میں یہ دو رنگی اور گفتار و کردار میں کھلا تضاد نہ جانے کب دور ہوگا اور کب ان لوگوں کی آنکھیں کھلیں گی۔ شیعہ فقہ جعفریہ کے مطابق "تسمیہ" یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی بلند آواز سے پڑھتے ہیں اور اسے نماز میں سنن واجبہ میں سے شمار کرتے ہیں۔ تفسیر کبیر میں فخرالدین رازی نے اس پر بحث کرتے ہوئے صاف صاف لکھا ہے کہ اس سنّت ثابتہ کو معاویہ نے اپنے دورِ اقتدار میں محض اس بناء پر منسوخ کر دیا کہ یہ عمل امیرالمومنین سیدنا علیؑ کے معمولات میں سے تھا اور جنابِ امیرؑ کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے عین مطابق تھا مگر معاویہ نہیں چاہتا تھا کہ امیرالمومنینؑ کے آثارِ خیر میں سے کوئی عملِ خیر بھی باقی رہے جس سے دلوں میں ان کی یاد تازہ ہو اس لیے اس نے جہر بالتسمیہ پر پابندی عائد کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ یہ شخص امیرالمومنین کی دشمنی میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس کا بس چلتا تو وہ ہر عملِ خیر کی راہ مسدود کر دیتا۔ شیعیانِ علیؑ کے بارے میں ماتم گساری کی رسم پر بہت لے دے کی جاتی ہے۔ عزا کی مجالس، ماتمی جلوس، سینہ کوبی، اشک افشانی اور اسی قبیل کے دیگر ماتمی مظاہروں کو ہدفِ تنقید و ملامت بنایا جاتا ہے اگرچہ صرف ایک شعر سے اس کا جواب دیا جا سکتا ہے ؎

نمی دانم زمنع گریہ مطلب چیست واعظ را
دل از من دیدہ از من، اشک از من آستیں از من

جن لوگوں نے ایوب خاں اور پھر بھٹو کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یا دوسرے ملکوں میں جہاں کہیں بھی ظلم

حکمرانوں کے خلاف مظلوموں نے اپنی نفرت وحقارت کا اظہار کیا ہے بلا استثنائے مذہب وملت احتجاج کے لیے ہر جگہ سینہ کوبی کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر ظلم کی نوعیت جتنی زیادہ سنگین ہوگی سینہ کوبی اور ماتم گساری کا رنگ اتنا ہی گہرا ہوگا اور اشک ریزی وچاک دامنی کا سلسلہ اتنا ہی دراز ہوگا۔ آل محمد علیہم السلام پر دشتِ کربلا میں جو شرمناک مظالم روا رکھے گئے اس کے خلاف احتجاج کا یہ سلسلہ صدیوں سے جاری وساری ہے اور ظلم کی سنگین نوعیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے جگر گوشہ اور لختِ جگر کو ان کے فرزندوں، بھائیوں اور بھتیجوں سمیت ذبح کر دیا گیا اور خانوادۂ نبوت کی مخدرات عصمت کو سرِ عام رسوا کیا گیا۔

یہ وہ بھیانک ظلم ہے کہ اس کے خلاف احتجاج کی یہ رسم رہتی دنیا تک جاری رہنی چاہیئے اور ظالموں پر لعنت کا یہ سلسلہ قائم رکھنا ضروری ہے۔ اسلام ظالموں کے استیصال اور مظلوموں کی حمایت کا سب سے بڑا علم بردار ہے[1]

---

[1] کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اس دورِ تہذیب وتمدن میں جبکہ جمہوری حقوق اور حقوق شہریت کا چرچا عام ہے اور حکومتی یا عوامی سطح پر کئے جانے والے معمولی ظلم کے خلاف پوری دنیا میں ہاہاکار مچ جاتی ہے۔ تاریخ اسلامی کے پہلے تین خلفاء اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اموی اور عباسی خلفاء کے مظالم پر ہم یوں پنبہ دہن اور مہر بلب ہو جاتے ہیں گویا ان حضرات کو ظلم وستم کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بہت برا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اب پوری دنیا میں یہ تاثر عام ہے کہ اسلام اور جمہوریت اسلام اور شہری حقوق، اسلام اور آئینی اقدار کبھی یکجا نہیں ہو سکتے اس کا سہرا ہمارے ان نام نہاد خلفاء کے سر ہے۔ جن کا دور جبر واستبداد کا بدترین دور رہا ہے۔ آج کل "ایمنیسٹی انٹرنیشنل" اور اسی نوع کے دیگر ادارے قائم ہیں جو دنیا بھر کے (باقی حاشیہ ص پر)

غم زندگی کا سب سے بڑا پائیدار قدر ہے۔ جگر نے کہا تھا ؎

خوشی میں بھول نہ جانا جگر یہ راز حیات
کہ جو خوشی ہے یہاں اک امانت غم ہے

اور غم خواہ غم جاناں ہو، یا غمِ دوراں ہر صورت میں زندگی کو دل گداز اور رقت انگیز بنا دیتا ہے۔

دنیا میں بحیثیت ایک جماعت یا گروہ کے اگر کسی فرقے نے غم کو اپنا لازمۂ حیات بنایا ہے تو وہ صرف شیعیانِ علی علیہ السلام کا گروہ ہے جس نے غم حسینؑ سے اپنا رشتہ کچھ اس طرح جوڑا کہ ان کے ہاں خوشی کی تقریب ہو یا ماتم کا موقعہ وہ صرف حسینؑ کے ماتم سے اپنے دلوں کی دنیا آباد رکھتے ہیں۔

ع "بنا لیا ہے ترے غم کو جاوداں میں نے" کی جو کیفیت ہر شیعہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اس کی لذتوں سے وہ لوگ کیونکر باخبر ہو سکتے ہیں جو معاویہ مروان و

(بقیہ حاشیہ ص ــــ) ملکوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ جہاں انسانی حقوق کی پامالی کا کوئی سنگین واقعہ پیش آئے اس کے خلاف آواز بلند کریں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خلافت راشدہ کے تین خلفاء اور ان کے بعد دور بنی امیہ و بنی عباس کے حکمرانوں کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے تاریخِ اسلام کے آغاز ہی سے ایک ایسا زبردست ادارہ قائم ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ شیعیان علی کا ثابت قدم گروہ تھا جس نے اسلامی تاریخ کے ظالم حکمرانوں کی بدعنوانیوں کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی۔ اس اعتبار سے مسلک شیعیت دنیا کا پہلا ادارہ ہے جس نے ظلم کے خلاف، جبر کے خلاف، استبداد کے خلاف اور غصبِ حقوق کے خلاف اور غصب حقوق کی ہر کوشش کے خلاف بڑے منظم طریقے پر آواز بلند کی اور لب و قلم کو جنبش اضطراب بخشی۔

یزید جیسے بد نہاد ظالموں کا جشن ولادت مناتے اور یوں ظالموں کی فہرست میں اپنا شمار کراتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لختِ جگر کی مظلومیت کا غم وماتم شیعیانِ علیؑ کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے اور وہ اس سرمایہ کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں کہ اس سے ان کی دنیا بھی سنورتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی سنوار دی گئی ہے۔ فانی بدایونی نے خوب کہا تھا ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول   تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

باقی رہا شیعیان کرام کے ہاں علم لہرانے، تابوتِ سکینہؑ کا جلوس نکالنے ذوالجناح کے اہتمام اور تعزیے کی رسوم کی ادائیگی کا معاملہ تو یاد رکھئے کہ اسلام "تمثال" کا مخالف ہے۔ تمثیل کا نہیں۔ ہمارے سُنّی علماء کو اب تک تمثال اور تمثیل کا فرق ہی نہیں معلوم ہوا۔ اسلام بت پرستی کے ہر مظاہرے سے ناخوش ہوتا ہے اور بُت سازی و بُت گری یہ ہے تمثال، اور کسی واقعہ کو ڈرامائی شکل دے کر اس کی یاد برقرار رکھنا یہ ہے تمثیل اور تمثیل بہت سے اسلامی احکام کی جان ہے۔ صفا اور مروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بذاتِ خود کوئی مقصود بالذّات عبادت نہیں ہے بلکہ سیدہ ہاجرہ سلام اللہ علیہا کی اس تگ و دو اور اس اضطراری کیفیت کی ایک ڈرامائی تمثیل ہے جس کا بے ساختہ اظہار ان کی جانب سے اپنے تشنہ لب بچّے کی جان بچانے کی خاطر پانی کی تلاش کے سلسلے میں ہوا۔

صفا مروہ کے درمیان "وسعی" کی یہ رسم اس امر کی واضح علامت ہے کہ اسلام تمثیل کو جائز بلکہ مستحسن قرار دیتا ہے۔ اسی طرح "رمی جمار" (شیطان پر پتھراؤ کرنا) بھی اسی ڈرامائی تمثیل کا ایک حصّہ ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو قربان گاہ کی جانب لے جارہے تھے تو شیطان نے انہیں اس ارادے

سے باز رکھنے اور بہکانے کی کوشش کی اور انہوں نے اس کو پتھر مارے اور قربانی کی رسم بھی قربانی اسمٰعیلؑ کی ڈرامائی تمثیل ہے جسے دنیا بھر کے مسلمان ہر سال بڑے اہتمام سے ادا کرتے ہیں۔ حج کے تمام مناسک بھی ایثار و قربانی ابراہیمؑ و اسمٰعیل ہی کی تمثیل ہے بنابریں واقعۂ کربلا کی یاد کو زندہ و پائندہ رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ قصۂ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی یاد تازہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے واقعہ سے معرکۂ کربلا کا واقعہ زیادہ فکر انگیز اور عبرت خیز ہے۔ اقبالؒ نے ٹھیک کہا ہے ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

کیا یہ محض اتفاق تھا کہ وادی فرات سے ایک بوڑھا شخص اپنی بیوی اور اکلوتے بچے کو لے کر چلا اور حجاز کی بے آب و گیاہ وادی میں اس نے قربانی و ایثار کی ایسی درخشاں روایت قائم کی کہ نسلِ انسانی کی امامت کا اعزاز اس کے سر بندھا۔

اور پھر تین ہزار برس کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد تاریخ نے خود کو دہرایا۔ اب وادی حجاز سے ادھیڑ عمر کا ایک شخص اپنے کنبے کے چھوٹے بڑے سبھی افراد کو لے کر وادئ فرات کے ایک بے آب و گیاہ صحرا میں اترا اور اس نے قربانی و ایثار کی وہ جوت جگائی کہ پوری کائنات ارضی و سماوی اس کی ضیا باریوں سے جگمگا اٹھی اور تب اس کے سر اقدس پر امامت کبریٰ کا وہ لازوال تاج رکھ دیا گیا کہ نیزے کی انی بھی اس مقدس و مطہر سر سے اس تاج کو جدا نہ کر سکی۔ یہ تاج امامت آج اسی کے سر کی زینت ہے اور رہتی دنیا تک اسی کی اولاد امجاد اس کی وارث و امین بنی رہے گی۔ صلوٰت اللہ تعالیٰ وسلامہٗ علیہم وعلیٰ من تبعہم باحسان الیٰ یوم الدین سوان دونوں واقعات میں جو گہری مماثلت موجود ہے اس کے پیشِ نظر اگر ذی الحجہ کی دس تاریخ ابراہیمؑ کی عزیمت و ایثار و قربانی کا یادگار تہوار ہے اور ہر سال بڑے اہتمام سے اس کو منایا جاتا ہے تو عاشور محرم کی تابندہ روایت کا باقی رکھنا بھی عین تقاضائے اسلام ہے کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد۔

ایک سوال جو سنّی حلقوں میں بڑی شد و مد سے اٹھایا جاتا ہے یہ ہے کہ امیرالمومنین سیّدنا علیؓ ابن ابی طالبؑ اگر خود کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے تو انھوں نے اپنے اس حق کے لیے آواز کیوں نہیں اٹھائی اور اس کے لیے کوشاں کیوں نہ ہوئے؟

اس کا ایک جواب تو خود خلیفۂ دوم کے اس مکالمے میں موجود ہے جو اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ مذکور ہے۔ یہ دراصل ایک پروپیگنڈہ تھا جو خلیفۂ دوم اور ان کے ساتھیوں نے کر رکھا تھا کہ نبوت کا اعزاز تو بنو ہاشم کو مل چکا اب حکمرانی کا اعزاز اس خاندان کو نہیں ملنا چاہیئے۔ چونکہ یہ پروپیگنڈا کامیاب رہا تھا اور قبائلی طرزِ زندگی میں اس قسم کے بیہودہ پروپیگنڈے کو بڑی آسانی اور تیزی سے فروغ حاصل ہوا۔ اسی لیے قبائلِ عرب اس پروپیگنڈے کے زیرِ اثر اس امر پر تقریباً متفق ہو چکے تھے کہ حضرت علیؑ کو حضورؐ کی خواہش کے برخلاف منصبِ خلافت سے دور رکھا جائے۔ لیکن اصل سوال جوں کا توں باقی رہتا ہے کہ جب خلافت پر امیرالمومنینؑ کا حق مسلّم تھا تو قبائلِ عرب کی پروا کئے بغیر امیرالمومنینؑ نے اس حق کی بازیابی کے لیے جدّ و جہد کیوں نہ فرمائی۔ اخلاق و محاسن و کمالاتِ انسانی پر جن لوگوں کی گہری نظر ہے اور جو لوگ عظمتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں سے بہ خوبی واقف ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ وہ لوگ جنہیں شرفا کی اصطلاح میں مکمّل شریف انسان (PERFECT GENTLE MAN) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کا اندازِ زندگی یہ رہا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملے میں جتنے فرض شناس، حساس اور پابند اخلاق ہوتے ہیں اپنے حقوق کے بارے میں اُتنے ہی سیر چشم بے غرض اور کریم النفس ثابت ہوتے ہیں۔ امیرالمومنین سیدنا علیؑ کی ذات اقدس و اطہر تو بلندیٔ اخلاق کی اس اعلیٰ و ارفع سطح پر تھی کہ اس سے بلند تر سطح کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ ہم نے اپنے رو بہ زوال معاشرے میں ایسے بلند و بالا صفات کے حامل لوگ دیکھے ہیں کہ ان کے حقوق غصب کئے گئے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ نہ کسی مجلس میں حرف

شکایت زبان پر لائے بلکہ اگر کسی نے اس موضوع پر بات چھیڑی بھی تو انھوں نے موضوع سخن بدل دیا۔ فدک کے معاملے میں جو ظاہر ہے امیر المومنین کا نہیں بلکہ ان کی رفیقۂ حیات کا معاملہ تھا۔ پوری زندگی میں وہ صرف ایک بار لب کشا ہوئے اور وہ بھی ضمناً ایک بات آئی اور نکل گئی۔ بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں ہمیں یہ فقرہ ملتا ہے جس سے امیر المومنین کی شانِ بے نیازی جھلکتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں: بلا كانت فی ایدینا فدك من كل ما اظلمت السماء فشحت علیها نفوس قوم وسخت عنها نفوس قوم آخرین (ہاں ایک فدک تھا جسے ہم اپنا کہہ سکتے تھے اس بھری پری دنیا میں، مگر اس کے دینے پر بھی کچھ لوگوں نے بخل سے کام لیا اور کچھ لوگوں نے بے نیازی کی راہ اپنا کر اس سے دست کش ہونے کو ترجیح دی۔)

سو تہذیب و انسانیت کی اعلیٰ اقدار جنھیں جان و مال سے زیادہ عزیز ہوں وہ اپنے حق سے محرومی پر ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ خاموش رہنا اپنی فطری پاکیزگی اور جبلی شرافت کا ناگزیر تقاضا سمجھتے ہیں۔ حضورؐ کے فوراً بعد حالات نے جو رخ اختیار کیا اور صورتِ حال جس طرح بگڑی اس کے پیشِ نظر امیر المومنینؑ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے حق کی بازیابی نہیں تھا بلکہ اسلام کا تحفظ اور اس کی بقا کا مسئلہ درپیش تھا جیسا کہ استیعاب اور اصابہ میں امیر المومنینؑ کے ایک خطبے کے اقتباس سے مترشح ہوتا ہے اور اس لیے امیر المومنین نے اسلام کے وسیع تر مفاد پر اپنے مفاد کو قربان کر دیا۔ یہ ایک صادق الایمان انسان کا اختیاری عمل تھا جو شعور و آگہی کے فیصلے پر مبنی تھا۔ یہ کوئی اضطراری کیفیت نہیں تھی کہ امیر المومنین پر بزدلی یا مصلحت کوشی کا الزام عائد کیا جائے۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین کے خطبات و ارشادات و مکاتیب کا مستند مجموعہ ہے اس میں آپ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:-

"اگر میں کچھ بولتا تو لوگ کہتے اسے خلافت کی حرص ستا رہی ہے اور اگر

چپ بیٹھا رہتا تو کہتے کہ علی ابن ابی طالبؑ موت سے ڈر گیا حالانکہ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا شیر خوار بچّہ اپنی ماں کے پستان سے اور اگر امت میں تفرقہ کا ڈر نہ ہوتا اور یہ اندیشہ لاحق نہ ہوتا کہ دین کا نام و نشان مٹ جائے گا تو میں ضرور اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتا اور اس کے حصول کی تگ و دو کرتا۔"

بدنہاد اور دون فطرت حریفوں اور معاندوں اور مخالفوں کا یہ ہمیشہ سے انداز رہا ہے کہ اگر کوئی شریف النفس انسان اپنے غصب شدہ حق کے لیے آواز نہ اٹھائے تو یا تو اس کی خاموشی کو بزدلی پر محمول کیا جاتا ہے یا پھر سرے سے اس کے حق دار ہونے ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے اور اہلِ سنّت انہیں دونوں باتوں پر عمل پیرا ہیں۔

خدایا ان لوگوں کو ہدایت کی توفیق ارزانی فرما کہ یہ علی ابن ابی طالبؑ کی عظمت و شرافت سے آگاہ ہو سکیں۔

درِ دل پہ دستک

سخن سازی اور عبارت آرائی مقصود نہیں ہے۔ صرف احقاقِ حق اور ابطال باطِل کا پیش نظر ہے ـــــ شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات ـــــ یہ حریفانہ کشمکش کی کوئی داستان نہیں ہے۔ یہ مناظرے کا کوئی اسلوب بھی نہیں ہے، نہ یہ مجادلہ و مکابرہ کی کوئی شکل ہے۔ یہ تو محض سادہ اور صریح لفظوں میں اظہار مطالب و معانی کی ایک مخلصانہ اور دردمندانہ کوشش ہے۔ ممکن ہے یہ ایک سعی ناتمام ہو لیکن یہ بہر حال ایک مثبت کوشش ہے اور صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ تاریخ کے سراپردوں میں چھپے ہوئے بہت سے واقعاتی پہلو ایسے ہیں جن تک شاید سطح بین نگاہیں نہ پہونچ سکی ہوں۔ سو ان واقعات کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کرنے سے شائد حقائق کا بہتر طور پر ادراک ہو سکے اور انصاف پسند لوگ جو تعصب، تنگ نظری اور جانب داری کی روش سے ہٹ کر واقعات کے پس منظر سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں اور کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کی جدوجہد میں ہیں۔ ان کے سامنے تصویر کا اصل رُخ اور صورتِ حال کا صحیح نقشہ آ سکے۔

اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تہذیبی ارتقاء کے اس دور میں اگر مسلمان قوم حقائق کے لیے اپنے دل و دماغ کے دریچے وا نہیں کرتی تو پھر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ وہ علم و عقل اور فکر و نظر سے محروم ایک مبغوض قوم ہی خدا کی نظروں سے گری ہوئی ایک بے وقار قوم، جس کا دانش و خرد کی بستیوں میں گزر نہیں اور جو محض اپنے بر خود غلط اسلاف کی اندھا دھند تقلید کی بھول بھلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسروں

کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے والی قوم علم و دانش کے اس تیز رفتار سفر میں دیگر اقوام عالم کا مقابلہ کیوں کر کر سکتی ہے۔ ایسی افسانہ وافسوں کی ماری ہوئی قومیں خود بھی ایک افسانہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں یہ قوم آخر کب تک مبروص چہروں کو رنگین اور دلفریب نقابوں سے چھپاتی رہے گی، کب تک چند من گھڑت اصطلاحات کا سہارا لے کر جھوٹی عظمتوں کے محل ریت کی دیوار پر اٹھاتی رہے گی۔ کب تک حقائق پر پردہ ڈالنے کی سعی رائیگاں میں مصروف رہے گی۔ کب تک صداقتوں کا منہ چڑایا جاتا رہے گا۔

اگر کسی کے ذہن و دماغ میں خود ساختہ نظریات اور بے سروپا روایات کا جھاڑ جھنکاڑ اس حد تک جڑ پکڑ چکا ہے کہ اب کسی معقول بات کے لیے اس میں جگہ باقی نہیں رہی تو ایسا شخص ہمارا مخاطب نہیں کہ "میں نہ مانوں" کی دلیل کا کوئی توڑ آج تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ لیکن اگر دل میں خدا اور رسولؐ کی محبت مرتسم ہو، اگر تمام چھوٹی بڑی شخصیتوں سے صرفِ نظر کر کے صرف ایک ذاتِ اقدس یعنی حضور ختمی مرتبتؐ مرکزِ نگاہِ عقیدت و محبت ہو تو مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اہلِ دل، اہلِ نظر کے لیے اس کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ہدایت کا نامہ بر اگر کسی جویائے حق اور باضمیر انسان کے در دل پہ دستک دے تو مجال انکار ممکن نہیں، تب سرتابی اور روگردانی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں، یہ خیر و فلاح کی ایک پُرامن دستک ہے۔ ہر اس دروازۂ دل پر جسے شخصیتوں سے زیادہ نظریات عزیز ہیں، جسے افراد کی بجائے اصول سے محبت ہے، جسے اپنے گروہی اور شخصی رجحانات سے کہیں زیادہ تاریخ کے حقائق سے دلچسپی ہے، جو دین کو پیغمبرؐ کے حوالے سے سمجھنا چاہتا ہے۔ کسی ایرے غیرے کی ذہنی اختراع کے ذریعے نہیں، جو سرچشمۂ ہدایت صرف حضور نبی اکرمؐ کو سمجھتا ہے اور اپنے دل و دماغ کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اپنا مرکزِ عقیدت و محبت اسی ذاتِ گرامی کو بنائے ہوئے ہے۔

میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ مسلمان قوم بحیثیت مجموعی اس حد تک ذہنی

پستی کا شکار ہو چکی ہے کہ ہدایت واصلاح کی کوئی آواز بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والاصفات سے والہانہ محبت تکمیل ایمان ودین کی شرطِ اوّل ہے اور اس جذبۂ بے اختیار کا اولین تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کے اہلِ بیتؑ اور اور آپ کی آل اطہارؑ سے غیر مشروط وفاداری کا عہد استوار ہو اگر یہ نہیں تو محبت پیغمبرؐ کا ہر دعویٰ جھوٹا اور عشقِ رسولؐ کی ہر تعلّی مشکوک۔

دوستوں کی دوستی چاہنے والوں کی چاہت اور محبت کرنے والوں کی محبت کی پرکھ دوست داروں کی اولاد سے محبت اور حسن سلوک بھی ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے دوستی کا کیف وکم ناپا جاتا ہے یہ وہ معیارِ محبت ہے جس سے احباء واقربا کے تعلقِ خاطر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے۔ اولاد کی قیمت پر دوستی نباہنا غیر فطری بات ہے جبکہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا پیغمبرؐ فطرت کے مقاصد کا سب سے بڑا نگہبان دار فطرتِ انسانی عقل سلیم ہو تو کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ اولاد سے دشمنی کرنے والوں کو منہ لگائے۔

جو شخص آپ کی اولاد کا دشمن ہو، جس نے ان کے راستے میں کانٹے بچھائے ہوں، انہیں بدسلوکی اور بے مروتی کا نشانہ بنایا ہو، ان پر معاش کے دروازے بند کیے ہوں۔ خواہ آپ کا کیسا ہی جانی دوست اور یار غار کیوں نہ ہو، آپ کی نظر میں ایسے شخص کی دوستی دشمنی ہی کا ایک بھیانک روپ ہے۔

یہ ایک سراسر منطقی اور بدیہی فارمولا ہے۔ اس اصول کو اگر آپ اپنے دعوائے محبت رسولؐ پر منطبق کر کے دیکھیں تو آپ کو ہر اس نام نہاد دوست اور جانشین پیغمبرؐ سے نفرت ہو جائے گی جس نے پیغمبر کی وصیت کو ٹھکرایا ہو۔ پیغمبر کی اکلوتی بیٹی اور چہیتی صاحبزادی کو ان کے باپ کی طرف سے عطا کی ہوئی جائداد سے محروم کیا ہو۔ آپ کے بیٹوں اور نواسوں کو ستایا ہو اور آپ کے اہلِ بیتؑ کے ساتھ بدمعاملگی کا وطیرہ اختیار کیا ہو۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جنہیں ہر مکتب فکر کے مورّخ نے اپنی کتابوں میں درج کیا

ہے اور شیعوں سے زیادہ سنیوں کی کتابوں میں ان کی تفصیلات بکثرت موجود ہیں۔ اس لیے تاریخ کا کوئی ادنیٰ طالب علم بھی ان واقعات کی صحت کے بارے میں شک و شبہہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔ بنابریں میں ہر اس شخص سے جس کے دل میں حضور نبی اکرم صلے اللہ وآلہ وسلم کی محبت کی ادنیٰ سی رمق بھی موجود ہے یہ التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنے دل کا جائزہ لے اور سوچے کہ اس نے حضور نبی اقدس واکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت کے تقاضوں کو کہیں اپنی جماعت کے افکار و نظریات کی قربان گاہ کی بھینٹ تو نہیں چڑھا دیا؟

دو متضاد سمتوں کا مسافر

میں خود ایک عرصہ تک اہل سنّت والجماعت کا ایک فرد رہا ہوں اور اس مسلک کا پرجوش حامی و مبلغ بھی اور میرے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں بھی کبھی شیعہ بن سکتا ہوں۔ لیکن تاریخ کے بے لاگ مطالعہ نے مجھے جادۂ سنیّت سے ہٹا کر شیعیت کی آغوش میں لا ڈالا۔ تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ میرے لیے ایک چونکا دینے والا تجربہ تھا۔ یہ ایک ایسا دروازہ تھا جس نے بہت سے دروازے مجھ پر بند کئے اور بہت سے دروازے کھولے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ سُنّی ہونا یا اہلِ سنّت والجماعت کے گروہ سے وابستگی دراصل ایک ایسے انسان کے روپ میں خود کو پیش کرنا ہے جو بیک وقت دو متضاد سمتوں کا مسافر ہے۔ وہ حق کا متلاشی بھی ہے اور باطل کا پرستار بھی، وہ اندھیروں اجالوں کا بیک وقت خریدار ہے، وہ دو کشتیوں کا ایک ایسا سوار ہے جس کے مقدر میں ڈوب مرنا لکھا جا چکا ہے، وہ خوب و ناخوب دونوں کی جستجو میں ہے، وہ کھوٹے اور کھرے سکوں کو جمع کر کے روز بازارِ آخرت میں اپنے لیے جنّت کی دائمی مسرت خریدنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خسارے کا سودا ہے۔ آگ اور پانی، پھول اور انگارے ایک ساتھ دامن میں سمیٹنے کا فن ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔

جو لوگ عقل و خرد کی ہر بات سے آنکھیں اور کان بند رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مداوا میں تو کیا خدا بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے میرا روئے سخن صرف ان سعید روحوں کی جانب ہے

جو سچائی کے متلاشی، حق کے خریدار، باطل سے بیزار اور راہ راست کے طلبگار ہیں۔ وہ لوگ میرے مخاطب نہیں جو کھرے کھوٹے اور جھوٹ سچ میں امتیاز کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ فمن لم یجعل اللہ لہ نورا فمالہ من نور (جنھیں خدا کی طرف سے سچائی کا نور نصیب نہ ہوا انہیں کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔)

یہاں ایک بات اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں کے بارے میں بھی کہتا چلوں کہ ان میں سے بیشتر کتابوں میں تاریخی واقعات کی ترتیب کا انداز کچھ اس نوعیت کا ہے کہ واقعات کے پس منظر کے بارے میں مطلقاً آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ نہ تو ان واقعات کے تجزیہ و تحلیل کا کوئی اہتمام ان کتابوں میں موجود ہے، نہ اس امر کا کوئی التزام ہے کہ جس شخصیت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں اور جس شخص کو بانس پر چڑھایا جا رہا ہے وہ بذاتِ خود کس حیثیت کا مالک ہے اور اس کی قرار واقعی منزلت و مقام کیا ہے۔

حالانکہ تاریخ محض واقعات کے اظہار یا ان کے اعادہ و تکرار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ مؤرخ کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تاریخی واقعات کے پس پردہ عوامل کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کرے۔

تاریخ اظہارِ حقیقت کا نام ہے، اظہارِ عقیدت یا مدحت آرائی اور منقبت سرائی کا نام تاریخ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر مورخین کا انداز تاریخ کے باب میں عموماً قصیدۂ مدحیہ کا سا رہا ہے۔ اس سلسلے میں واقعات کے پسِ منظر کو جو تاریخ کا ناگزیر حصّہ ہے اکثر و بیشتر نظرانداز کر دیا گیا ہے اور باقاعدہ کوشش کی گئی کہ واقعاتی منظر و پسِ منظر کو تاریخ کے طالبان علم سے مخفی رکھا جائے۔ اور یہ سب کچھ محض اس لیے کیا جاتا رہا کہ ممدوح شخصیتوں کا تقدس مجروح نہ ہونے پائے اور ان کی مفروضۂ عظمت کا بھرم نہ کھل جائے۔ تاریخ کے مطالعہ کے لیے خاص ذوق کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور نگاہ نکتہ رس کی بھی۔ واقعات کی

کی ترتیب میں جو الٹ پھیر ہوا ہے اور حالات کی افتاد میں غلط تعبیر کے ذریعے جو رنگ آمیزی کی گئی ہے ان پر نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

تاریخ کی وضع و ترتیب میں مسلمانوں نے فن اسماء الرّجال کی آڑ میں جو دھاندلی کی ہے اس کا بھی پوری طرح ادراک نہیں ہو سکا۔ جب لوگوں کو اس کا علم ہو گا تب پتہ چلے گا کہ پانی کہاں مرتا ہے۔

بیسیوں تو صرف صحابہ کی شخصیتیں سراسر فرضی ہیں مگر ان کے نام اور ان کی روایتیں کتب احادیث کی زینت بنی ہوئی ہیں اور فنِ اسماء الرجال والے اپنی اس بے بضاعتی اور کم مائے گی کا نوٹس لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

خدا بھلا کرے عراق کے اس عظیم عالم علامہ مرتضیٰ عسکری کا جنھوں نے اپنی ایک کتاب ہر اس موضوع کے لیے وقف فرمادی اور اس کا نام رکھا "مائۃ وخمسون صحابی مختلق" ڈیڑھ سو فرضی صحابہ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بد دیانتی کا پول کھلتا ہے جو دانستہ طور پر فن اسماء الرجال کے علماء نے روا رکھی ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ چودہ سو سال بعد کا ایک محقق تو ان فرضی شخصیتوں کا سراغ لگا لے اور ہزار بارہ سو برس پہلے کے لوگ خود اپنے فن سے اس قدر کورے ہوں کہ انہیں پتہ ہی نہ چل پائے کہ کون سی شخصیت اصلی ہے اور کون نقلی۔

عہد صحابہ کی تاریخ - ایک افسوسناک ورق

عہد صحابہ کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیجئے۔ ایک اندھے مقلد یا کور دیدہ مقلد کی طرح نہیں ایک غیر جانب دار مبصر کے زاویۂ نگاہ سے۔ تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس دور میں اسلام کے مزاج کو بگاڑنے، اسلام کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرنے اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کیسی کیسی ناپاک کوششیں بروئے کار لائی گئیں۔

یہی وہ دور تھا جب ایک منظم منصوبہ کے تحت قرآن مقدس میں معنوی تحریف کی گئی، واقعات وحقائق کو مسخ کیا گیا، عالم گیر صداقتوں پر خطِ تنسیخ کھینچا گیا اور تاریخ کی زبان گنگ کر دی گئی۔ جی ہاں! اسی دور میں جسے خیر القرون (بہترین دور) کا نام دیا گیا وہ سب دھاندلیاں روا رکھی گئی ہیں جن سے شرافت وشائستگی کی اقدار پامال ہوئیں، اخلاقی حدود و ضوابط کی رعایت و پاس داری ختم ہو کر رہ گئی اور اسلام کا نظام عدل ومروت دسیسہ کاریوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ زیرِ نظر کتاب دراصل عہدِ صحابہ ہی کی تاریخ کا بڑا افسوسناک ورق ہے۔ یہ اس دور کی کہانی ہے جب ابھی اسلام کی تاریخ کا روز تاریخ تھا اور محمد کریم علیہ وآلہ والتسلیم کی حیاتِ جسمانی کا رابطہ دنیا سے تازہ تازہ منقطع ہوا تھا اور زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ آئی تھی جو اس پیغمبرؐ کے ساتھی شمار ہوتے تھے۔

دنیا میں شاید ہی کسی قوم نے اپنی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور میں ناسپاسی، احسان فراموشی اور ناشکری کا وہ انداز اختیار کیا جو اس دور کے سربرآوردہ صحابہ نے خود اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ روا رکھا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ جو کچھ کیا گیا اسے بعض خود ساختہ اصطلاحات کے ذریعہ سند جواز بخشی گئی اور اس دَور کے ہر قول و فعل کو تنقید سے بالاتر قرار دے کر آزادیٔ رائے، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ تقریر و تحریر کو بیدردی سے کچل دیا گیا ۔

مذہب غلام، روح غلام آبرو غلام　　　آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

عقائد ہوں یا اعمال، افکار ہوں یا اقوال، نظریات ہوں یا احوال غرضیکہ فکر و نظر، قول و فعل اور خیر و شر کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مداخلت بے جا کا ارتکاب نہیں کیا گیا اور اسلامی تعلیمات کا کوئی گوشا ایسا نہیں جس میں رد و بدل نہ کیا گیا ہو۔

سب سے بڑا ظلم تاریخ اور فن تاریخ پر ڈھایا گیا کہ اسے اسناد کے ساتھ بے بس کر دیا گیا۔ اس کے ہونٹ سی دیئے گئے۔ اس کی زبان بند کر دی گئی اور اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ وہی کچھ کہے جو اس دَور کا برسرکار اور بااختیار طبقہ اس سے کہوانا چاہتا تھا۔ فن تاریخ اس سے پہلے کبھی ان جکڑ بندیوں کا شکار نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ لگی لپٹی رکھے بغیر واقعات کی صحیح عکاسی کرتا رہا ہے۔ اسے اپنی باتوں کی تصدیق و توثیق کے لیے کبھی کسی سند کا محتاج نہیں ہونا پڑا۔ وہ روایت درایت کا ایک خود کار نظام اپنے اندر رکھتا ہے جو تنقید کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور بذاتِ خود رطب و یابس اور غلط و صحیح میں خطِ امتیاز کھینچ سکتا ہے۔ لیکن عہدِ صحابہ میں اسے ایک نئے اور تلخ تجربہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تھا فنِ تاریخ کے لیے سند کا اہتمام، جیسے "حدثنا فلاں" اور "اخبرنا فلاں"، کے لایعنی سلسلے اور "عن و من" کی مہمل تکرار اور "قال قال" کے بے سروپا التزام اور "رُویَ" اور "قیل" کی مجہولانہ روایات کے ذریعے تاریخ پر مسلط کر دیا گیا اور اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی گئی۔ چنانچہ فنِ تاریخ کا بھی وہی حشر ہوا جو "آئینے کے پیچھے طوطی" کا ہوتا رہا ہے اور اس نے بھی — "آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم" — کا انداز اختیار کر لیا۔

اور تاریخ تو رہی بجائے خود، اس پابند اسناد روایت سازی کے ذریعے خدا کی آخری

اور سچی کتاب قرآن مقدس کے لبوں پر بھی مہر لگادی گئی اور وہ صحیفۂ آسمانی جو "عالمین" کے لیے ہدایت کا منشور بن کر آیا تھا خاموش تماشائی بن کر رہ گیا۔

چنانچہ آیاتِ قرآنیہ کے معانی و مضامین پر جب کبھی غور کرنے کا موقع میسر آیا تو یہ دیکھا کہ اس آیت کے ظاہر عبارت سے جو مفہوم مترشح ہوتا ہے اس کے سراسر خلاف راویان حدیث ایک اور ہی موضوع پر طبع آزمائی کر رہے ہیں یعنی وہی بات۔ ہوئی کہ "من چہ می گویم وطنبورہ من چی می سراید" قرآن کا متن کچھ کہہ رہا ہے اور اس کے شارح ومفسر دوسرا راگ الاپ رہے ہیں۔

کسی جرم کے ارتکاب میں خواہ کتنی ہی رازداری سے کام کیوں نہ لیا گیا ہو وہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ یہ گویا قانون مکافات کا قدرتی ردِ عمل ہے۔ مزید برآں علم وخرد اور تہذیب وتمدن میں ارتقاء کا جو ایک قدرتی عمل کارفرما ہے اس سے بجا طور پر یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

انسانی جبلت اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ہی نہج پر اور یکساں انداز میں کام کرتی آئی ہے، حسد، بغض، رقابت، دوستی، دشمنی، محبت، عداوت، صلح جنگ، امن پسندی اور ہنگامہ آرائی، سطحی جذبات اور پسند وناپسند، تعلّی وخودنمائی، عجز وانکسار، کبر ونخوت، رعونت وانانیت، سادگی وسہل پسندگی، فقر واستغنا، دنیا طلبی اور جاہ پسندی اور اسی قبیل کی بے شمار خوبیاں اور خرابیاں، برائیاں اور اچھائیاں ہر دور کے انسان کا ورثہ رہی ہیں۔ مشہور انقلابی لیڈر مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تفسیری تشریحات میں "سورۃ العصر" کے حق میں بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ "العصر" یعنی زمانہ جس کی قسم کھائی گئی ہے اس سے مراد وہ گزرا ہوا زمانہ ہے جس کی جھلکیاں ہمیں حال میں بھی نظر آئیں اور مستقبل میں بھی۔ گویا اس سے مراد تاریخ کے مختلف ادوار ہیں۔ مطلب یہ کہ تاریخ کی قسم کھائی گئی ہے اور اسے گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جن مراحل سے گزر رہی ہے وہ انہی مراحل سے آئندہ بھی گزرتی رہے گی۔

میری سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی اور میرا خیال ہے کہ کوئی معقول انسان اسے درست تسلیم نہیں کرے گا کہ ایک انسانی معاشرے میں تمام افرادِ امت یکساں جذبات و احساسات اور مساویانہ صلاحیت و استعداد کے حامل رہے ہوں۔ بہ ایں طور کہ ان کی دیانت و امانت، ان کا زہد و تقویٰ، ان کی پرہیزگاری اور نیکوکاری کا معیار ایک رہا ہو، ان کے ایمان کی کیفیت برابر سرابر رہی ہو، ان کی ذہنی و علمی سطح میں کوئی فرق نہ ہو، ان کے فکر و عمل کا، ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ یکساں ہو اور ان کی اخلاقی اور تہذیبی حالات میں کوئی تفاوت نہ ہو۔

خیر محض کا وجود انسانی معاشرے میں ممکن نہیں۔ یہ دنیا جب سے معرض وجود میں آئی ہے خیر و شر کا تضاد اور نیکی و بدی کا تصادم جاری ہے اور جب تک اس کرۂ ارض پر نسلِ انسانی کا وجود باقی ہے۔ یہ تضاد برقرار اور یہ تصادم جاری رہے گا:-

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

صحابہ کی پوری جمعیت کے متعلق یہ گمان رکھنا کہ ان میں ہر شخص خیر مجسم تھا اور وہ سب سراپا تقویٰ و طہارت لوگ تھے، ایک انہونی، ناقابلِ فہم اور قطعاً ناممکن العمل بات ہے لیکن ہمارے نام نہاد دینی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں نے اس باب میں جو سبق ہمیں سکھایا ہے اور جو پٹی ہمیں پڑھائی، وہ یہ ہے کہ الصحابہ کلہم عدول (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) اور صحابہ سے مراد انسانوں کا وہ گروہ جس نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جمال جہاں آراء سے اپنی آنکھیں روشن کی ہوں خواہ اس گروہ کے کچھ لوگ کتنے ہی سیاہ باطن کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کے کرتوت کیسے ہی قابلِ نفرت اور لائق ملامت

کیوں بنہ رہے ہوں نگران کی صفتِ عدالت ہر حالت میں قائم رہے گی۔ بگڑتے میں بھی زلف اُس کی بنا کی۔

"اہلِ سنّت والجماعت کے نزدیک صحابہ کا عادل ہونا بہ ایں معنیٰ ہے کہ:

"عدالت اس کیفیت راسخہ درنفس کا نام ہے جو ملازمت تقویٰ و استعمال مروت پر آدمی کو آمادہ رکھے۔" (مکالمہ سید محمود رضوی و مولوی اسمٰعیل گوجروی، مطبوعہ مکتبہ رضوان گنج بخش روڈ لاہور ۹)

لیکن تاریخ و حدیث کی بیشمار کتابوں میں صحابہ کی غیر عادلانہ روش اور ان کی بے مروتی کی جو سینکڑوں داستانیں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں ان سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ صحابۂ عادلین ایسی ایسی ناانصافیوں کے مرتکب ہوئے، ایسے ایسے خلاف تقویٰ عمل ان سے سرزد ہوئے اور بے مروتی اور بدکرداری ایسی ایسی قبیح حرکتیں ان سے سرزد ہوئیں کہ تاریخ آج تک ان کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی۔ ان صحابہ کا کردار بعض حالات اور متعدد موقعوں پر اتنا شرمناک اور شرافت و اخلاق سے اس درجہ گرا ہوا نظر آتا ہے کہ ہمیں ان کے مقابلہ میں اپنے ماحول اور معاشرہ کے اخلاق باختہ لوگ زیادہ شریف اور پاک باز نظر آتے ہیں۔

قصّۂ فدک

بے مروتی کے سلسلے میں صرف ایک "فدک" ہی کا ایک قصہ کچھ کم عبرت انگیز نہیں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد ان کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی نورِ چشم اور لختِ جگر بلکہ "پارۂ زجان و جگر گوشۂ پدر" سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ساتھ جانشینانِ پیغمبرؐ کی بدسلوکی، بے مروتی اور بدمعاملگی کا جیسا شرمناک مظاہرہ کیا گیا اس کے لیے کوئی اخلاقی جواز مہیا کیا جاسکتا ہے؟

وہ سیدہ فاطمہؑ جنھیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی خصوصی چاہتوں اور محبتوں سے نوازا، جنھیں دنیا جہاں کی تمام عورتوں کی سرتاج "سیدۃ نساء العالمین" اور خواتین اہلِ جنّت کی سردار "سیدۃ نساء اہل الجنۃ" کے گرانقدر خطابات سے نوازا، جن کے بارے میں پیغمبر علیہ وآلہٖ السّلام کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ ارشاد ہوا۔

فاطمہ بضعۃ جسدی یریبنی ماارابھا ویوذینی ما اذاھا

(فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے اس کی ہر پریشانی میری پریشانی اور اس کا ہر دکھ میرا دکھ ہے۔)

نیز فرمایا:—

فاطمہ بضعۃ منی فمن ابغضھا فقد ابغضی۔

(فاطمہؑ میرے وجود کا حصّہ ہے جس نے اسے برہم کیا اس نے میری خفگی اور برہمی مول لی۔)

یہی سیّدہ فاطمہؑ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عطا کئے ہوئے قطعۂ اراضیٔ باغ فدک کا مطالبہ کرتی ہیں تو ان کے مطالبے کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کبھی ان سے گواہ پیش کرنے کو کہا جاتا ہے اور کبھی وراثت انبیاء ہی کا سرے سے انکار کر کے ان کی بات کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

تمام کتبِ حدیث جن میں "صحیح بخاری" بھی شامل ہے ایسی روایتوں سے بھری پڑی ہے کہ سیدہ فاطمہؑ اپنے جائز حق سے محروم کر دی گئیں اور اس بناء پر وہ خلیفۂ اوّل ابو بکر بن ابی قحافہ سے ناراض ہو گئیں اور مرتے دم تک اس شخص سے بات کرنا بھی گوارا نہ فرمایا۔

بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

نوحدت فی ذالک فاطمہ فھجرت فلم تکلمہ حتی توفیت۔

(سیدہ فاطمہؑ اپنے مطالبہ کے مسترد ہو جانے پر ابوبکر سے ناراض ہو گئیں۔ انہوں نے ابوبکر سے قطع تعلق کر لیا اور پھر تاحین حیات اسے منہ نہیں لگایا۔)

تعجب ہے کہ پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھنے والے، اس پر ایمان لانے والے اور اس کی جوتیوں

کے صدقے میں تختِ خلافت پر متمکن ہونے والے اتنے بے حس، بے مروت، بدلحاظ شوخ چشم، گستاخ اور سنگ دل بھی ہو سکتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی ایک معمولی سی فرمائش کو پورا کرنے کے بھی روادار نہیں ہوئے۔

صحابہ کی برسرِاقتدار جماعت کے سامنے ان کے پیغمبرؐ کی صاحبزادی اپنا ایک دعویٰ پیش کر رہی ہیں اور وہ لوگ نہ صرف یہ کہ اس دعوے کو مسترد کر دیتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کرنے میں بھی ان صحابہ کو کچھ تامل نہیں ہوتا۔

یہ کیسے لوگ تھے جو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے فیض صحبت سے بہرہ ور ہوئے تھے مگر پیغمبرؐ کی اولاد کو اتنا پیار اور احترام بھی نہ دے سکے جیسا کچھ ادب و احترام ہم اپنے اساتذہ و مسلمین کی اولاد کو دیتے چلے آتے ہیں۔ شبلی نعمانی نے "الفاروق" میں گومگو کے انداز میں اس واقعہ کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"ابن ابی شیبہ نے "مصنف" میں اور علامہ طبری نے تاریخ کبیر میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہؑ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "یا بنت رسولؐ اللہ خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں تاہم اگر آپ کے یہاں لوگ اسی طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔" اگرچہ سند کے اعتبار سے اس روایت پر ہم اپنا اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے کیونکہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا[1] تاہم روایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی

---

[1] یہ صاحب جو تاریخ نگاری کرنے چلے ہیں انہیں اتنا شعور بھی نہیں کہ ایک روایت جو زبان زد عام ہے اور جسے وہ خود بھی پیش کر رہے ہیں اس کے رواۃ کے بارے میں تو کم از کم چھان بین کر لیتے کہ آیا اس کے راوی ثقہ ہیں یا غیر ثقہ۔ یعنی وہی مثل ہوئی کہ پاس نہیں ہیں دانے اماں چلی بھنانے۔"

کوئی وجہ نہیں۔ حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت میں حضرت عمر نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں ان میں گو بعض بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا۔ بنو ہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اس وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہ میں واقع ہوئیں۔ (الفاروق ص ۱۲۴-۲۵ طبع دوم مارچ ۱۹۴۹ء مطبوعہ مہتمم ثناء اللہ ریلوے روڈ۔ لاہور)

بنو ہاشم سے بغض تو خیر خلفائے ثلاثہ اور ان کے قصیدہ نگاروں کی متاع مشترک ہے اور اس کا ذکر آگے کہیں آئے گا لیکن مجھے یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی بیگم زبیدہ کا وہ فقرہ یاد آ گیا جب اس کے لڑکے امین الرشید کو قتل کر کے اس کا یہ سوتیلا بیٹا مامون الرشید سریر آرائے سلطنت ہوا تو زبیدہ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ مامون اس سے امین کی ماں ہونے کے ناطے بدسلوکی کا معاملہ کرے گا۔ چنانچہ اس نے مامون کے نام ایک خط میں اس کے باپ کے حوالے سے لکھا تھا۔

وتذکر من لو کان حیا لکان شفیعی الیک۔"

"مجھ سے کسی قسم کا معاملہ کرتے ہوئے اس بات کو ضرور ذہن میں رکھنا کہ آج اگر وہ شخص (یعنی میرا شوہر اور تمہارا باپ) زندہ ہوتا تو وہ تمہاری بارگاہ

جہاں تک اس روایت کے مستند ہونے کا تعلق ہے تو اہل سنت کے تمام نامور محدثین اور مؤرخین نے اس روایت کو اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ ابن قتیبہ نے اپنی مشہور کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں اس ناپاک جسارت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ حدیث کے سب سے بڑے مجموعے "کنز العمال" میں علی متقی نے اسے درج کیا ہے۔

میں میری جانب سے ایک سفارشی بن کر پیش ہوتا۔)

اور تاریخ بتاتی ہے کہ مامون نے زبیدہ کے ساتھ حسن سلوک کے معاملے میں اپنے آپ کو ہمیشہ یاد رکھا لیکن وہ ذاتِ اقدس واطہر جو شفیع المذنبین ہے اس کی بیٹی کے معاملہ میں اس کے والدگرامی کے سفارشی ہونے کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔

خلیفۂ دوم کا یہ مداح تسلیم کر رہا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہؑ کے مکان کو آگ لگانے کی دھمکی دی گئی اور خلیفۂ دوم نے اس موقع پر بے اعتدالیوں سے کام لیا۔ لیکن وہ ان بے اعتدالیوں کو یہ کہہ کر سندِ جواز عطا کر رہا ہے کہ اگر عمر ابن خطاب ایسی بے اعتدالیاں نہ کرتے تو بنوہاشم کی سازشیں کامیاب ہو جاتیں۔

اگرچہ خوب! اگر ابوبکر و عمر خلافت پر قبضہ جمانے کے لیے سازشیں کریں۔ بے اعتدالیوں کے مرتکب ہوں، دھونس، دھمکی، دھاندلی کا وطیرہ اپنائیں تو یہ سب کچھ بالکل بجا و درست اور بنوہاشم ان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف مل بیٹھ کر سوچیں تو یہ سازشیں مصنّف بنوہاشم کا تذکرہ اس انداز میں کر رہا ہے جیسے یہ کوئی اسلام دشمن ٹولہ تھا جس کی سازشوں سے اسلام کی تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔ اور یہ کون لوگ تھے۔ سیدہ فاطمہؑ دخترِ رسولؐ، حضرت علیؑ داماد رسول و ابن عم رسول اور حضرت عباسؓ عم رسولؐ کیا ان تینوں کو یہ حق نہیں پہونچتا تھا کہ وہ خلافت کے باب میں اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کریں؟ کیا ابوبکر کی خلافت خدا کی وحی سے ثابت تھی کہ اس کے خلاف کچھ سوچنا بھی جرم تھا اور شبلی نعمانی کو بنوہاشم کی سوچ بھی سازش اور عمر ابن خطاب کی بے اعتدالیاں بھی قابلِ ستائش نظر آتی ہیں ؎

چہ ولاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد

رسول اللہؐ کے خانوادۂ عظمت کا تذکرہ اس گستاخانہ انداز میں اور وہ بھی سیرۃ النبیؐ کے مصنف کے قلم سے لیکن اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مؤرخوں کے ممدوحین کی

گستاخی اور بد لحاظی اور بے مروّتی کا کیا عالم ہوگا۔ ؏

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

یہ اندازِ تحریر، یہ طرزِ تاریخ نگاری خود بتا رہی ہے کہ رسولؐ اللہ کی ذاتِ اقدس سے ان لوگوں کے دلوں میں آج بھی بغض و عناد بھرا ہوا ہے۔ رسول اللہ اور ان کے خانوادہ شرف امجد پر حرف آجائے تو آجائے مگر ان کے ممدوحین پر آنچ نہ آنے پائے۔ ؏

کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

بنو ہاشم کو رسوا کرنے کی یہ کوئی پہلی سازش نہیں تھی جو شبلی نعمانی کے نوک قلم پر آگئی بلکہ اس کا سر نقطہ، آغاز بھی خلیفہ، اوّل و دوم کی بے مروتی اور شوخ چشمی کے سر بندھا ہے۔

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس موقع پر اگر خلیفہ، دوم جناب کا وہ مکالمہ درج کر دیا جائے جو انھوں نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے ساتھ خلافت کے موضوع پر کیا تو پتہ چلے گا کہ بنو ہاشم کے خلاف بغض و نفرت شروع ہی سے ان لوگوں کے دلوں کا ناسور بن چکی تھی۔ عمر ابن خطاب نے جناب عبداللہ ابن عباس سے کہا تھا:-

"هيهات ابت والله قلوبكم يا بنی هاشم الاحسدا ما يحول وضغنا وغشا ما يزول"

(انساب الاشراف بلاذری الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ)

"افسوس اے بنی ہاشم! تمہارے دلوں سے حسد، کینہ، بغض و نفاق ابھی تک دور نہیں ہوا۔

اس پر حضرت عبداللہ ابن عباس نے فوراً جواب دیا تھا۔

مهلا یا امیر المومنین لا تصف قلوب قوم اذهب الله

عنهم الرجس وطهرهم تطهیر ابالحسد واغش فاف قلب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من قلوب بنی ھاشیم
رک جایئے اے مسلمانوں کے امیر! جن لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے
یہ فرمایا ہو کہ وہ ہر آلائش سے پاک اور صاف ہیں۔ آپ انہیں حسد و نفاق سے
متصف کر رہے ہیں۔ آپ کو اتنا بھی خیال نہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ و آلہ
وسلم کا دل بھی تو بنو ہاشم ہی کے ایک فرد کا دل تھا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ انہی خلیفہ دوم نے بڑی ترنگ میں حضرت عبداللہ
ابن عباس سے کہا تھا۔

کرھنالکم ان تجتمع النبوۃ والخلافۃ معاً فی بیت واحد

(ہمیں یہ بات ناپسند تھی کہ نبوت و خلافت ایک ساتھ ایک ہی گھر میں جمع
ہو کر رہ جائیں۔)

اس تعلّی کا دندان شکن جواب مسکت جواب حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہ دیا تھا۔

"خدا نے اپنے فیصلے تمہاری پسند و ناپسند کے مطابق نہیں کیے۔ تمہیں تو یہ
پسند نہ تھا کہ نبوت بنو ہاشم کے ایک فرد کے حصے میں آئے۔"

محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل میں مسند فرمانروائی پر متمکن ہونے
والے ایک معمولی چرواہے کا لڑکا کس لہجہ اور کس گستاخانہ انداز میں ڈینگیں ہانک رہا ہے۔

اور یہ وہی عمر ابن خطاب ہیں جو بستر علالت پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے اس ارشادِ گرامی کو کہ "قرطاس اور قلم لاؤ کہ میں تمہیں ایک ایسی بات لکھ دوں کہ میرے بعد
تم گمراہی سے بچ سکو۔"
یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ:۔

ان الرجل لیھجر ویھدو (سسر العالمین للغزالی ص ـــ)

یہ شخص یعنی رسول خدا ہذیان بک رہا ہے یا بیہودہ بول رہا ہے۔ (العیاذ باللہ)

تہذیب و شرافت کی زبان سے جو لوگ آشنا ہیں وہ کسی بزرگ و محترم شخصیت تو کجا کسی عام آدمی کے لیے بھی الفاظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو منہ میں آیا بک دیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک کے لیے لفظ ہذیان، وہی شخص استعمال کر سکتا ہے جسے نہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت و محبت ہو نہ تہذیب و اخلاق سے اس کا کچھ واسطہ ہو نہ مقام نبوت سے کچھ آشنائی۔

تاریخی پسِ منظر

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے حدیث و سیر کی مبسوط کتابوں میں بہ استثنائے چند واقعات کی ترتیب یا انداز بہ طور خاص اس نوعیت کا رکھا گیا ہے کہ واقعات کے پسِ منظر سے مطلقاً آگاہی حاصل نہیں ہوتی نہ ان واقعات کے پیش منظر و پس منظر میں کوئی رابطہ محسوس ہوتا ہے، نہ واقعات کے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت کسی مورخ نے محسوس کی اور کرتے بھی کیوں کہ اس سے ان کی عقیدتوں کے محل خود کے اپنے ہاتھوں مسمار ہو جاتے۔

کیا تاریخ محض واقعات کے اعادہ و تکرار ہی کا نام ہے؟ کیا مورخ کا یہ بنیادی فرض نہیں کہ وہ ان واقعات کے پس پردہ محرکات کو بھی بے نقاب کرے۔

مثلاً سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے باب میں جو ڈرامہ کھیلا گیا، انصار و مہاجرین کے درمیان جو چپقلش رونما ہوئی اور جس طرح ایک شخص نے اس ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کیا مؤرخین کی ذمہ داری نہ تھی کہ وہ اس صورتِ حال کی وضاحت پیش کرتے جو وہاں رونما ہوئی اور فرد واحد کو جس بنا پر یہ مقتدر ہونے کا موقع ملا اس کے اسباب و علل و عوامل پر روشنی ڈالتے؟

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں حضرت عمر کا نام کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ حضورؐ کے عہد ہمایوں میں نہ ابوبکر کو کسی نوع کی سماجی یا دینی برتری حاصل تھی۔ نہ عمر کو۔ کسی مستند یا صحیح روایت میں یہ نہیں ملتا کہ حضورؐ کسی دینی معاملہ میں ان لوگوں سے مشاورت فرماتے تھے اگرچہ بعض فرضی، خود ساختہ، جعلی اور وضعی روایتوں کے ذریعے ان دونوں شخصیتوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں لیکن وہ تمام روایات نقد و جراح کی رو سے سراسر مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہیں اور خود اہلسنت ہی کے نامور محدثین نے ان میں سے ایک ایک روایت کے مجروح، ضعیف اور موضوع ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اگر کوئی روایت بفرض محال سند کے اعتبار سے درست بھی ہے تو روایت کی رو سے لغو اور لایعنی ہے۔

راویانِ حدیث کی جرح و نقد کے فن پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں اس امر کی تصریح ملتی ہے کہ "فضائل شیخین" پر جتنی بھی حدیثیں کتب صحاح میں موجود ہیں وہ سراسر موضوعات اور جعلی ہیں۔ خاص طور پر یہ حدیث کہ:

"اقتدوا الذین بعدی ابی بکر و عمر"

(میرے بعد ان دو کی پیروی اختیار کرو یعنی ابوبکر اور عمر کی۔)

یا مثلاً وہ مشہور حدیث کہ:

"اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم"

(میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔)

ابن تیمیہ جیسے غالی خارجی نے بھی اپنی کتاب "المنتقی" میں اسے یکسر موضوع اور من گھڑت حدیث قرار دیا ہے مگر منبروں پر واعظ آج بھی اس سے چٹخارے لیتے نظر آتے ہیں۔ تہذیب التہذیب، کمال فی اسماء الرجال اور تذکرۃ الموضوعات جیسی کتابوں کا تتبع کیجئے

ان سب "فضائل و مناقب" کا بھرم کھل جائے گا۔

میں نے کتبِ حدیث میں ان احادیث کا جائزہ لیا ہے جو شیخین کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہیں تو ایک عجیب انکشاف ہوا کہ خلیفۂ اوّل کی منقبت میں بیشتر حدیثیں یا تو خلیفۂ دوم کی روایت کردہ ہیں یا پھر لے دے کے حسب ذیل افراد میں سے کسی ایک کی طرف منسوب ہیں۔

(۱) عبداللہ بن عمر (۲) عائشہ (۳) عبداللہ بن عمرو العاص (۴) ابوہریرہ (۵) عبدالرحمان بن ابی بکر (۶) حفصہ (۷) مغیرہ بن شیبہ

اسی طرح خلیفۂ دوم کی فضیلت میں جن احادیث کا چرچا ہے وہ یا تو خلیفۂ اوّل کی روایت کردہ ہیں کہ دنیا کا دستور ہے۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ یا پھر وہی مذکورہ بالا افراد جن کا اوپر حوالہ دیا گیا اور یہ سب کرایہ کے راوی اور پیشہ ور داستاں گو ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ کی فضیلت میں جو حدیثیں وضع کی گئیں ان میں انہی افراد کی روایتوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے جس سے صاف طور پر ملی بھگت اور چنڈال چوکڑی کا سراغ ملتا ہے۔

اس کے برعکس جن احادیث میں اہلِ بیتؑ نبوت بالخصوص امیرالمومنین علیؑ کے مناقب و فضائل کا تذکارِ جمیل ہے ان میں ایک بھی راوی حضرت علیؑ کے اپنے قریبی رفقاء میں سے نہیں ہے۔ نہ ابوذر غفاری، نہ سلمان فارسی، نہ عمار یاسر، نہ مقداد، نہ بلال بلکہ ان روایتوں کے راوی کم و بیش سب ہی مخالف گروہ کے لوگ ہیں اور اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی مبحث بیچ میں آگیا بات ہو رہی تھی اس ناشدنی کی کہ ایک شخص جو رسولؐ اللہ کے عہد ہمایوں میں قطعاً بے اثر تھا یہ کیسا عجوبہ ہے۔ حضورؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی یکایک اتنا طاقتور بن گیا کہ امت کی پوری ہیئت اجتماعیہ اس ایک شخص کی مرضی اور خواہش کے تابع ہو کر رہ گئی۔ یہ بھی نہیں کہ یہ شخص کوئی بہت بڑا سورما تھا اور اس کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی یا غزوات و سرایا میں اُس نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ

ہر جگہ اس کی بہادری کے چرچے تھے۔
جنگ احد میں میدانِ جنگ سے فرار اور غزوۂ خیبر میں ان کی مہم کی ناکامی کا ذکر تاریخ کا حصّہ بن چکا ہے اور اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔
ایسا شخص، ہماری مراد عمر ابن خطاب ہے حضورؐ کے وصال کے فوراً بعد ایک ایسی شخصیت بن کر ابھرتا ہے جس کے ہاتھ میں ملتِ اسلامیہ کے تمام معاملات کی باگ ڈور آجاتی ہے اور وہ جسے چاہتا ہے اس کے سر پر خلافت کا تاج رکھ دیتا ہے اور اصحابِ رسولؐ میں سے جس کو چاہتا ہے زدوکوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا بلکہ اس کی شورہ پشتی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ پیغمبرؐ کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کو جا کر دھمکاتا ہے اور اس کے مکان کو آگ لگا دینے کی دھمکی دیتا ہے۔
وہ کیا حالات تھے جو ایک بے حیثیت شخص کے "بادشاہ گر" (KING MAKER) بننے کا موجب بنے اور ساری قوت اسی کے ہاتھ میں مرتکز ہو کر رہ گئی۔

جیش اُسامہ

جیش اُسامہ کی تیاری خود حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے ہوئی۔ اس لشکر میں سپاہیوں کے نام بہ نام شمولیت بھی حضورؐ اکرم کے ایماء اور فرمان کے ذریعے عمل میں لائی گئی یعنی حضورؐ ہی نے فرداً فرداً ایک ایک شخص کو اس فوج کے لیے نامزد فرمایا۔ ان عام سپاہیوں میں نام نہاد عاشقانِ رسولؐ کا وہ ٹولہ بھی تھا جو بعد میں امور خلافت کی بندر بانٹ میں پیش پیش رہا۔ اس لشکر اسامہ میں ابوبکر اور عمر بھی شامل تھے اور انہیں اس میں کوئی نمایاں مقام بھی نہیں دیا گیا تھا۔ فوج کے چار اہم عہدوں میمنہ، میسرہ، قلب، مقدمۃ الجیش میں سے کسی عہدے کے قابل بھی ان دونوں بزرگوں کو نہیں سمجھا گیا۔ مگر

کسی مورّخ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ ان حالات کا کھوج لگاتا کہ فوج کے دو ادنیٰ سپاہی کیونکر اس مرتبہ و مقام تک پہونچے کہ وہ حضورؐ کے مقرّر کیے لشکر میں اپنی ذمّہ داریوں سے اعراض و انحراف کر کے حصول خلافت کی تگ و دو میں براہ راست شریک ہو گئے۔ انہیں یہ کس نے موقع فراہم کیا۔

جیش اسامہ میں ایک معمولی اور عام سپاہی کی حیثیت میں اپنی نامزدگی پر انھیں اعتراض تھا۔ مگر حضور نے اس اعتراض کو پرکاہ کی وقعت بھی نہ دی اور انہیں لشکر اُسامہ میں کوئی ادنیٰ اسی اہمیت، یا معمولی عہدہ و منصب دینے سے بھی انکار فرمایا مگر ایسے کم سواد اور بے حیثیت لوگوں کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ فوج میں اپنی نامزدگی از خود منسوخ کر کے مسند خلافت پر براجمان ہو گئے۔

طالع آزما فوجیوں اور ابن الوقت قسم کے لشکریوں کی بابت تو اس قسم کے واقعات تاریخ کے اوراق میں بہ کثرت ملتے ہیں کہ حکمراں کے مرتے ہی ان سے کچھ لوگوں نے اقتدار کی رسہ کشی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور حکومت پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن کیا کسی منظم، اصولی اور باقاعدہ منضبط فوج کے بارے میں بھی یہ سننے میں آیا ہے کہ اس نے اقتدار کی منتقلی میں اس سے گھٹیا کردار کا مظاہرہ کیا ہو جس کی نظیر ہمیں حضورؐ کے وصال کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ کے ہنگامے میں نظر آتی ہے۔ واقعات کے تانے بانے پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ آج اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اصل حقیقت کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر قرونِ اولیٰ اور ازمنہ وسطیٰ کے لوگ منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھے رہے اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مرقع بنے رہے۔ ہم نے دوسری جنگ عظیم کے ایک نامور ہیرو اور فاتح جنرل ڈگلس ہیک آرتھر کا حال اخباروں میں پڑھا ہے اسے جب امریکی صدر رہبری ٹرومین نے اس کے عہدے سے برطرف کیا تو وہ ڈسپلن کے پابند ایک فوجی کی طرح احتجاج کا ایک لفظ نکالے بغیر گھر آ کر بیٹھ گیا۔

مہذب قوموں کی یہی وہ روایتیں ہیں جو ان کے مستقبل کو تابناک اور ان کے حال کو درخشاں بناتی ہیں۔ بالخصوص فوجی نظم وضبط تو ایک ایسا قومی وملی تقاضا ہے کہ اس سے صرف وہی قومیں روگردانی کرسکتی ہیں جو فوضویت اور انارکی کی راہ پر گامزن ہوں۔ اور جن کا نصب العین کوئی نظریہ یا کوئی پروگرام نہیں بلکہ محض ہوس اقتدار ہو اور اقتدار کی اس جنگ کا جیسا بھونڈا مظاہرہ رسولؐ اللہ کے ان "مقربین بارگاہ" صحابہ نے کیا وہ "جیش اسامہ" سے خود کو مستثنیٰ کر لینے کی کارروائی سے صاف ظاہر ہے۔

شرمناک اور شر انگیز خطبہ

کتب حدیث وسیر کے اس مطالعے کے دوران جب میری نظر خلیفۂ اوّل ابوبکر ابن ابی قحافہ کے اس خطبے پر پڑی جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کے سامنے دیا گیا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کون بول رہا ہے اور کہاں سے بول رہا ہے۔

یہ خطبہ دراصل اس، ڈرامے کا نقطۂ عروج (CLIMEX) ہے جو اس موقع پر خلیفۂ دوم عمر ابن خطاب نے کھیلا تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ وہ ننگی تلوار لے کر مسجد نبوی کے دروازے پر کھڑے ہوگئے اور چلّانے لگے کہ: "جو شخص یہ کہے گا کہ محمدؐ انتقال فرما گئے ہیں میں اسے قتل کردوں گا۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۱)

اتنے میں جب بنو اُمیّہ کے حلیف قبیلہ بنو اسلم کے لوگ مدینہ میں داخل ہوگئے۔ تاریخ کے الفاظ میں مدینہ منورہ کی گلیاں بنو سلیم کے افراد سے کھچا کھچ بھر گئیں اور ڈرامے کا ایک اہم کردار جو اس مرحلے پر مدینہ سے باہر اپنی اراضی کی دیکھ بھال کیلئے گیا ہوا تھا یعنی جناب ابوبکر، تو اس نے آتے ہی مسجد نبوی میں یہ ایمان سوز خطبہ ارشاد